جملہ حقوق محفوظ

جلد (۱۰) مارچ سنہ ۱۹۰۶ء نمبر (۶)

ایڈیٹر
شیخ عبد القادر بی-اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

تصویر جناب محسن کاکوروی و جناب مولانا سید محمد علی صاحب اشہری

مضامین نثر

- کشتی اور طوفان — شیخ عبد القادر ۱۷
- فلسفہ جدید — ایک پروفیسر ۶
- ترکوں کی معاشرت — میرزا محمد سعید ایم اے ۱۲
- اگلے وقتوں کی وفاداری — میر نیرنگ بی-اے ۲۱
- منازل حیات — مولوی محمد عبد الراشد دہلوی ۳۹
- عالم ارواح کی سیر — خواجہ حسن نظامی دہلوی ۴۸

مضامین نظم

- حسن و زوال — شیخ محمد اقبال ایم-اے کیمبرج ۵۳
- شکر نعمت — مولوی عبد الغفور خان صاحب شہباز ڈائرکٹر محکمہ تعلیم بھوپال ۵۳
- ایک علمی جلسہ — حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی ۵۴
- نغمہ شوق — میرزا اعجاز حسین بی-اے دہلوی ۵۸
- لوازم شاعری — مولانا سید محمد علی اشہری ۵۹
- خواب عبرت — منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی ۶۱
- ترجمہ اینک آرڈن — سید محمد ضامن کنتوری ۶۲
- تازہ غزلیں { میر نیرنگ بی-اے / نواب عزیز یار جنگ عزیز } ۶۳

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ☐ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے۔

مخزن پریس لاہور میں شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر کے اہتمام سے چھپکر شائع ہوا

لاکھ بیماریوں کی ایک دوا (عہ)

یہ دوائی مفصلہ ذیل بیماریوں کا شرطیہ ہے (۱) گنٹھیا (۲) ہیضہ (۳) دست (۴) پیچش (۵) کھانسی (۶) زکام (۷) جگر کی بیماریاں (۸) قولنج (بادیبول) (۹) دمہ (۱۰) وجع العصب (۱۱) مرخ باد (۱۲) دائمی بدہضمی (۱۳) سرخی (۱۴) سوزش حلق (۱۵) نزلہ (۱۶) خسرہ (۱۷) درد دندان (۱۸) تشنج (۱۹) درد سر (۲۰) زخم (۲۱) موچ (۲۲) بخار (۲۳) جل جانا (۲۴) گلے کی بیماری (۲۵) موسمی دانے یا پھنسیاں (۲۶) گرانی شکم (۲۷) پشت کا درد (۲۸) موسمی بخار (۲۹) باری کا بخار (۳۰) کالی کھانسی (۳۱) درد جگر (۳۲) نقرس (۳۳) چوتھیہ بخار (۳۴) بچھو (۳۵) بھڑ (۳۶) شہد کی مکھی (۳۷) کن کھجورا (۳۸) سانپ اور ہر قسم کے زہریلے کیڑوں اور جانوروں کے ڈنگ اور زخم (۳۹) سوزش دل (۴۰) چوٹ چپیٹ (۴۱) پسلی کا درد (۴۲) اندرونی درد (۴۳) درد معدہ (۴۴) ہیسٹریل فیور (۴۵) پیٹ درد وغیرہ۔

یہ اندرونی اور بیرونی دونوں طرح پر استعمال کیجاتی ہے۔ جو شخص اس عجیب و غریب دوائی کو ہر قسم کے درد یا بیماری میں استعمال کرنے کے لیے ہمیشہ گھر میں موجود رکھتا ہے۔ وہ سینکڑوں روپے بچا لیتا ہے۔ جو اس کو دوسری حالت میں ڈاکٹر و حکیم کے نذر کرنے پڑیں۔ **قیمت** (عہ)

ہر قسم کی درد کا علاج

یہ دوائی ہر قسم کے درد کو خواہ سر میں ہو۔ دانت میں ہو۔ یا جسم کے کسی اور حصہ میں ہو۔ صرف بیرونی طور پر لگانے سے فوراً رفع کرتی ہے۔ ایسی مفید دوائی ہے کہ جو درد اس دوائی کے لگانے سے رفع نہ ہوگا۔ اس درد کو دنیا کی کوئی دوائی بیرونی طور پر لگانے سے اچھا نہ کر سکیگی۔ درد خواہ کتنی مدت کا کیوں نہ ہو۔ اچھا ہو جائیگا۔ قیمت (عہ)

المشتہر مدن گوپال کمپنی لاہور

حضرت محسن - کاکوروی

سید احمد علی - اکبری

مخزن

کشتی اور طوفان

وُہ دردناک نظارہ مشکل سے بھولیگا۔ جب مَیں نے ایک دن کشتی اور اُس کی سواریوں کو۔ ساحل کے قریب۔ ہزارہا لوگوں کے پیشِ نظر۔ طوفان کی لہروں کے زبردست تھپیڑوں سے عاجز آکر۔ ڈوبتے دیکھا۔

فرانس کا شمالی ساحل تھا۔ اور اتوار کا دن۔ ہزاروں تماشائی زن و مرد ساحل کے قریب اُونچے بند پر بیٹھے طوفان اور تلاطمِ دریا کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سکون کے وقت تو سمندر کے منظر کو دلکشا ماننے میں شاید کسی کو بھی کلام نہ ہو لیکن تلاطم کے وقت کا منظر بھی ایک پُرشوکت دلچسپی سے خالی نہیں۔ بشرطیکہ آپ سبکسارانِ ساحل میں ہُوں۔ مگر یہ دلچسپی اُسی وقت تک ہو کہ سامنے سمندر ہی سمندر ہو۔ کسی انسان کی جان یا کسی کشتی کی قسمت طوفان کے پنجے میں نہ ہو۔ ورنہ فوراً سخت سے سخت دل موم ہونے لگتے ہیں اور دلوں سے دُعائیں بے اختیار اُٹھتی ہیں۔ کہ الٰہی ان جانوں کی خیر ہو جو اس پُرشور حالت میں توکل بخدا پانی میں ناؤ ڈالے ہُوئے ہیں۔ جس دن کا مَیں ذکر کرتا ہوں۔ اُس دن سمندر زوروں پر تھا۔ موجیں بلیوں اُچھلتی تھیں۔ اور کبھی کبھی پانی ساحل کی ساری خشکی طے کر کے بند سے آ کر ٹکراتا تھا اور اس طرح اُچھلتا تھا کہ بند کے اُوپر کی زمین تر ہو جاتی تھی۔ اور جو لوگ وہاں بیٹھے ہُوئے

تھے۔ ان کے کپڑے بھیگ جاتے تھے لیکن تعطیل کا دن۔ فراغت کا زمانہ۔ سمندر کی یہ بے اعتدالیاں ہنسی میں ٹال دی جاتی تھیں۔ کسی عورت کے دامن تک اگر سمندر اپنا دستِ گستاخ بڑھاتا تھا تو کئی اور مشتاق ہاتھ بچانے دوڑتے تھے۔ اور چھتری کی ڈھال سامنے کر دیتے تھے اور عورت ہنستی ہوئی شکریہ ادا کرتی تھی۔ اگر کسی مرد کا دامن آبِ شور سے تر ہو جاتا تھا تو عورتیں تالی بجاتی تھیں اور وہ قہقہے پڑتے تھے کہ الامان۔ لوگ کھیلتے تھے اور پروا نہ کرتے تھے۔ کوئی اپنی جگہ سے ٹلتا نہیں تھا۔ ایک طرف باجا بج رہا تھا اور سینکڑوں لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ اور جو دور تھے وہ بھی اس کی سریلی صداؤں کے مزے لے رہے تھے۔ کہ اچانک ایک توپ کی آواز آئی۔ چار بجے کے قریب توپ کیوں چلی! سب حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ جاننے والے جان گئے کہ کوئی جہاز یا کوئی کشتی خطرے میں ہے اور یہ توپ بندرگاہ کے اس مینار سے چلی ہے جہاں ایک تجربہ کار بحری افسر اس نگہداشت پر متعین رہتا ہے کہ نواحِ بندر میں اگر کوئی ایسا حادثہ ہو تو فوراً اس کی اطلاع دے۔ نگاہیں سمندر کی طرف دوڑیں اور ایک بادبان پر پڑیں۔ جو اپنے کام سے عاری ہو چکا تھا اور اس سے ایک مستول پر اُتریں جو سرنگوں ہوتا جاتا تھا۔ کشتی کا ایک سرا پانی میں تھا اور دوسرا پانی کے اُوپر تھا۔ اور اس طرف مستول سے مضطربانہ لپٹے ہوئے دو آدمی نظر آتے تھے۔ سینکڑوں زن و مرد بے قراری کے ساتھ بند سے نیچے اُتر کر پانی کے قریب جانے لگے۔ اور بعض ہر اک کپڑے اُتار کر پانی میں کود دے کہ کشتی تک پہنچ کر اس کی مدد کریں۔ تھوڑی دیر میں دو کشتیاں پانی میں ڈالی گئیں جن میں وردی پوش ملاح یعنی ایسی سوسائٹی کے ملازم تھے جس کا کام ڈوبتوں کی جانیں بچانا ہے اور جو عموماً سمندر کے کنارے پھرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی ناواقف نہاتا ہوا تو دور تک چلا جائے اور غوطے کھانے لگے یا اور کوئی واقعہ ہو تو مدد کو پہنچیں۔ مگر موجوں کی یہ حالت تھی۔ کہ دونوں کشتیوں میں سے ایک بھی وہاں تک نہ پہنچ سکی جہاں کشتی ڈوب رہی تھی۔ یہ لوگ ہمت کر کے اس طرف کو

بڑھتے تھے مگر ایک ہی موج ایسی آتی تھی کہ مار کر پیچھے ہٹا دیتی تھی۔ اُتنے قدم بڑھنے نہیں پاتے تھے جتنے پیچھے دھکیل دیئے جاتے تھے۔ گویا سمندر زبانِ موج سے ان پر عتاب کرتا ہوا کہتا تھا۔ او۔ انسانِ ضعیف کے بے ادب ہاتھو ہٹو۔ اور اپنی بساط سے بڑھنے کی جرأت نہ کرو۔ یہ کشتی اور اُس کی سواریاں میرا شکار ہیں اور کس کی مجال ہو کہ میرا شکار مجھ سے چھینے اور میں کیا ہوں میں بھی نہنگِ اجل کا ایک مُنہہ ہوں۔ اُس نہنگ کا نوالہ اب تمہارے ہاتھ کیونکر آسکتا ہے"! اسی طرح وہ دلاور اور ہمدرد پیراک جوا لکا مُردکا کُود پڑے تھے۔ لطمہ موج سے عاجز آکر کنارے پر کھڑے بے بسی سے یہ خوفناک تماشا دیکھ رہے تھے۔ کشتی بان کے کئی یار دوست جان پہچان وہیں کنارے پر موجود تھے۔ اور ہاتھ مل رہے تھے۔ مگر کیا ہوتا تھا۔ کشتی دو چار دفعہ ڈوبی اور اُبھری۔ آخر صرف بادبان کا ایک حصّہ پانی کے اوپر تھا اور باقی سب پانی کے نیچے۔ ذرا سی دیر میں وہ بادبان بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا اور کشتی نذرِ طوفان ہوگئی۔

اس ہیبت ناک سین کے دیکھنے والوں کے چہرے اُس وقت دیکھنے کے لائق تھے۔ ایک مایوسی تھی جو سب چہروں پر چھائی ہوئی تھی۔ ایک رنج تھا جو سب دلوں پر مسلط تھا۔ ایک پریشانی تھی جو سب طرف آشکار تھی۔ ایسی ہی گھڑیوں میں بنی نوع انسان کی وُہ باہمی لازوال یگانگت ثابت ہوتی ہے۔ جس سے کیا اشخاص کیا اقوام کامیابی کے نشے اور دولت کمانے کی جد و جہد میں چشم پوشی کرلیتی ہیں۔ وہاں عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی۔ انگریز بھی تھے اور فرانسیسی بھی۔ پراٹسٹنٹ بھی تھے اور کتھالک بھی۔ چند سیاہ فام حبشی تھے اور چند گندم گون مصری۔ مراتش اور الجزائر کے کئی تاجر اپنی سُرخ ٹوپیاں پہنے کھڑے تھے۔ اور میں ایک ہندی بھی اسی گروہ کا ایک جزوِ قلیل تھا۔ مگر ہر ایک نبض ایک رفتار پر تھی۔ گویا ایک نبض تھی جو ان جانوں کے اس طرح ضائع ہونے کے صدمے سے مضطربانہ حرکت میں تھی۔ ایک دُوسرے سے پُوچھتا تھا۔ کہ مرنے والے کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے۔

پہلے تو جتنے مُنہہ تھے اتنی زبانیں - کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ - آخر ایک شخص سے جس نے اس کشتی کو روانہ ہوتے دیکھا تھا معلوم ہوا - کہ کشتی میں چھ آدمی تھے - ایک کشتی بان اور دو اس کے بچے - ایک چودہ سال کا جو کشتی چلانے میں مدد دیتا تھا اور دُوسرا آٹھ نو سال کا جس کو وُہ اکیلا گھر پر نہیں چھوڑ سکتا تھا - کیونکہ اُس کی ماں مر چکی تھی - یہ شخص کشتی لئے کنارے پر بیٹھا تھا - کہ تین مُسافر آئے - دو مرد اور ایک عورت - اُنہوں نے کہا ہم سمندر کی سیر کرنا چاہتے ہیں - ایک دو اَور کشتی والوں نے انکار کیا کہ آج طوفان آ رہا ہے - اس حالت میں کشتی دریا میں نہیں ڈالی جا سکتی - وہ مایُوس ہُوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں پھر اَور موقع نہیں ہے - کل واپس جانا ہے - یہ کشتی بان دلیر تھا - اُس نے کہا - آؤ - مَیں لے چلتا ہوں" وُہ ہنستے ہُوئے سوار ہو لئے - اور کشتی چلی - آدمی تھا کاریگر - خاصی دیر تک باوجود طوفان کے چلاتا رہا - مگر اُسکی اس دلیری اور اُن کے اس شوق کی آڑ میں موت شکار کھیل رہی تھی - ایک تھپیڑا ایسے زور کا آیا - کہ کشتی اس کے قابو میں نہ رہی اور اُلٹ گئی - بس پھر کیا تھا - نہ کہیں ٹھکانا لگنا تھا نہ لگا -

اب اُن آفت رسیدوں کی کہانی سُنو جو سیر کرنے نکلے تھے - وُہ تھے ایک میاں - ایک بی بی - اور ایک میاں کا بھائی - میاں - بی بی میں کچھ عرصے سے عشق صادق تھا اور آخر دونوں نکاح پر متفق ہو گئے تھے - اتوار کا یہ حادثہ ہے - اور ہفتے کے دن اُن کا بیاہ ہُوا تھا - دونوں کے ماں باپ زندہ تھے اور بیاہ ہوتے ہی یہ اُن سے ہنسی خوشی رخصت ہوئے تھے کہ اتوار کا دن یوں کاٹ کر پیر کو گھر آ جائینگے - ہفتے کو جب پادری اِن کے ہاتھ ملا کر اِن کو دُعا دے رہا ہوگا - تو اُسے کیا معلوم ہوگا کہ وُہ نکاح آسمان کے لئے باندھ رہا ہے - اور زمین پر اس نکاح کی مدت چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہیں ہے - مگر وُہ چوبیس گھنٹے ایسے تھے کہ اُن پر چوبیس سال کی خوشی قربان کر دینی چاہئے - کیونکہ اُن کا جو انجام ہوا وُہ ہرچند پُردرد اور غمناک ہے - مگر ایسا انجام ہے کہ کوئی طالب و مطلوب اُس سے بڑھ کر آرزو نہیں کر سکتے - دو ڈوبے تو اکٹھے ڈوبے - شب بھر موجوں کے سامنے اکٹھے سینہ سپر رہے - اور جب دُنیا

بھرنے یہ سمجھ لیا کہ قعرِ سمندر میں جہاں لاکھوں بندگانِ خدا کی بے نشان قبریں بنی ہیں۔ انکا بھی مزار بن چکا۔ تو اچانک سمندر کے جی میں یہ آئی کہ ان کا عشقِ صادق کم از کم پختہ اور مشترکہ مزار کا مستحق ہے۔ چلو۔ اِن کی لاشیں اُگل دو۔ باقی سب کو تو ہضم کر گیا۔ لیکن ان دونوں کو پیر کے روز ساحل پر پھینک دیا۔ پیر کو دریا کا سکون دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ کہ کل یہیں اس زور کا طوفان تھا۔ اور جہاں کشتی ڈوبی تھی۔ اُس جگہ کے قریب خشکی ہو گئی تھی۔ وہاں دو موم کی تصویریں پڑی تھیں۔ بیوی اپنے جاں نثار شوہر سے لپٹی ہوئی۔ بال چہرے پر پریشان۔ مگر صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سو رہی ہے۔ میاں کے چہرے پر یہ سکون نہ تھا۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ جوانمرد نے موجوں سے لڑتے لڑتے جان دی ہے اور اس جدوجہد کا نقش چہرے پر یادگار رہ گیا ہے۔

شناورانِ محبت تو سینکڑوں ہیں۔ مگر
جو ڈوب جائے وُہ پکا ہے آشنائی کا

[illegible]

تم ہو گی۔ لیکن وہ نوازش تو نہیں ہے — کچھ میری طرف سے تمہیں کاوش تو نہیں ہے
سرگرم ہے ہنگامہ تری جلوہ گری کا — خورشیدِ قیامت کی یہ تابش تو نہیں ہے
چھپ چھپ کے مجھے دیکھتے ہیں بزمِ عدو میں — منظور نہیں اپنی نمائش تو نہیں ہے
حیرت ہے یہ خط کس نے لکھا ہے مجھے یارب — اُس دستِ نگاریں کی نگارش تو نہیں ہے
دھوکے سے مجھے زہر پلانے کو ہے دشمن — اے زود پشیماں تری سازش تو نہیں ہے
پھر ان کو ملنے کی ٹھنی ہے مرے جی میں — اے دردِ جگر قصدِ سفارش تو نہیں ہے
ساقی تری خاطر سے ہوں مجبور پلا دے — اسوقت کسی چیز کی خواہش تو نہیں ہے
کرتے ہیں دعا وصل کی ہم اپنے خدا سے — کچھ آپ کی خدمت میں گذارش تو نہیں ہے
ذکر ہے الطافِ خفی عیب۔ مگر ہاں — منجملۂ اغلاط فواحش تو نہیں ہے
بے وقت ہوا تی نہ ہو حضرت کیفی — گرمی کے ہیں دن موسمِ بارش تو نہیں ہے

فلسفۂ جدید

آب نمائم آتش و سوم کنم جدید را

چوں بکتابت آورم فلسفۂ جدید را

حکمت کے معنی لغت میں تو جاننا۔ تعرّف کرنا۔ مضبوط کرنا۔ یقین کر لینا ہر شے کا اپنے محلِ مناسب پر رکھنا اور اصطلاحی حکمت میں بھی تمام موجُودہ چیزوں کا جاننا اور اُس کے موافق عمل کرنا ہے۔ اس مناسبت سے اُس کو اس اسم کے ساتھ موسوم کیا۔ مگر فلسفۂ جدید میں علاوہ پُرانی تحقیقات کے نئی اور انوکھی تحقیق ملحوظ رہتی ہے۔ اس لئے اس کے فنِ جغرافیہ لفظی میں حکمت کے لفظی تحقیق میں کچھ اُمور کا بھی لحاظ کیا گیا ہے۔ ایک حکیم کا قول ہو کہ اس کی اصل اِحْکَایَتْ مُتْ زمانۂ سابق میں فلسفے کے اسرار کا حکایت کرنا پسند نہیں کرتے تھے کہ مبادا اہل و نااہل ہر ایک کے کان تک پہنچکر غیر مناسب اور غیر محقق تغیر و تبدل کا نشانہ بن جائے اس لئے مُوجدِ اوّل نے اپنے شاگردِ اوّل کو جب سکھایا اشاعت سے روکا اُس نے اپنے اظہارِ فضل کے لئے یا تعمیم فائدہ کی غرض سے اشاعت پر اصرار کیا۔ اُستاد نے تنبیہاً کہا کہ اِحْکَایَتْ مُتْ یعنی حکایت کر گر اُس کا نتیجہ موت ہے۔ ہمزۂ وصل کا تو وجود و عدم برابر ہوتا ہے۔ بکثرت استعمال سے حذف ہوا۔ حائے ساکنہ کو ابتدا بسکون کی وجہ سے کسرہ دیا اَلسَّاکِنُ اِذَا حُرِّکَ حُرِّکَ بِالْکَسْرِ توالی کسرات کی وجہ سے کافِ مکسور ساکن کیا گیا۔ لفظ ہوا کثیر الاستعمال خفّت اسکی مناسبِ حال۔ اس لئے میم کا ضمہ فتحہ سے بدل دیا گیا۔ بعضے لفظی فلاسفروں کی رائے ہے کہ اس کی اصل اُحْکُمْتْ ہے۔ فلسفی مسائل کا اُس کے ایجاد کرنے والے نے اپنی نظر میں خوب متحکم و مضبوط بنایا تو غیر منظر فی متحان کے بعد اگلی زبان سے نکلا اُحْکُمْتُ یعنے تحکیم و مضبوط ہو گیا۔ ہمزہ وصل اڑ گیا اور کاف کے ساتھ جیسے وہی برتاؤ کیا گیا جو اوپر مذکور ہوا۔

فلسفہ

پُرانے لوگ تو کہتے ہیں کہ اس کی اصل فیلاسوفہ تھی ۔ فیلا کے معنے دوست رکھنے والے اور سوفہ کے معنے حکمت کے ہیں ۔ مجموع لفظ کے معنے ہُوئے ۔ حکمت کا دوست رکھنیوالا مگر حکمت کا دوست رکھنے والا حکیم ہو سکتا ہے نہ کہ حکمت ۔ فلسفہ جدید کی اصل جغرافیہ لفظی میں یوں ہے کہ فَل کے معنے رخنہ اور خلل کے ہیں اور سَفہ کے معنے ہیں بیوقوفی اور حماقت کے تحقیقاً اسم مشتق مخفف کیا گیا فلسفے کے مسائل حماقت کے خلل انداز ہوتے ہیں ۔ اِس لئے اِس نام کے ساتھ مسمّٰے ہُوا ۔ اور بعض کی رائے ہے کہ اسکی اصل فَلاسَفہ ہے ۔ جب فلسفے کے مسائل کا ظہور ہوا تو حماقت میں فتور اور سفاہت کا نام عالم سے دُور ہوا ۔ اس لئے اس نام سے مشہور ہوا ۔ اِصطلاحِ خاص میں پہلے لوگ فلسفہ اور حکمت کی تعریف یُوں لکھتے ہیں ۔ کہ حکمت نام ہے تمام موجُودات کے واقعی حالات جاننے کا انسانی طاقت کے موافق ۔ بعضوں نے قید یہ بھی بڑھائی ہے کہ اس کے موافق عمل کرنا ۔ فلسفہ جدید کی تحقیق میں یُوں سمجھا جاتا ہے کہ موجُودات کی قید اس تعریف میں فضول ہو اس لئے کہ فلسفہ میں بعضے معدومات کے حال سے بھی بحث کی جاتی ہے ۔ مثلاً خلاء موجُود نہیں ۔ ارتفاع نقیضین محال ہے ۔ شریک الباری ممتنع ہے ۔ کوئی مثلث قائم الزوایا موجُود نہیں وغیر ذالک ۔ ایسا ہی طاقت بشری کی قید بیکار معلوم ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ کوئی محدود المقدار چیز نہیں جسکی ابتدا و انتہا و اوسط متعین ہو ۔ تاکہ اُس مقدارِ قوت کے موافق جاننا حکیم ہونے کے لئے ایک حدِ معین قرار دیجاوے ۔ نہ یہ بات ہے کہ انسانی قوت سے جاننے کو حکیم بنانے میں کچھ دخل ہو ۔ اللہ بھی حکیم ہے ۔ وہاں انسانی قوت سے کیا سروکار ۔ بلکہ بشہادتِ قرآنی تو ساری قوتیں آلہی قوت ہیں اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۔

مجھے یہاں محض اُس بول چال کے موافق بحث کرنا ہے جو ہندوستان میں رواج پائی ہُوئی ہے مگر شتر ایسے اصُول کے ساتھ جو کسی خاص زبان کے ساتھ مخصوص نہیں گو بعضے

بعضے مسائل ایسے بھی ہونگے جن کو خصوصیت کسی زبان کے ساتھ ہو۔ مگر ایسے مسائل بہت کم ہیں۔ مثلاً جغرافیہ لفظی کے ایک تو اُس قسم کے مسائل ہیں جو تمام آوازوں کے ساتھ علاقہ رکھتے ہیں جیسے موسیقیات کے مسایل جو انسانی وجمادی اور حیوانی صوت اور اُس کی تاثرات و مراتب کے ساتھ متعلق ہیں۔ اور بعضے مخصوص آوازوں کے ساتھ۔ جیسے انسان بہائم طیور سباع جمادات نباتات بسائط عنصری کائنات الجو کے علاقہ رکھتے ہیں۔ رعد کی کڑک۔ بادل کی گرج اِن سب کا تعلق اسی فن سے ہو۔ بعضے وُہ مسائل ہیں جو عام الفاظ کے ساتھ چاہے موضوع ہوں چاہے مہمل متعلق ہیں۔ بعضے محض مفردات کے خواص کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مفردات کے خواص کیفی اور تاثیر فعلی اسی فن سے علاقہ رکھتی ہے۔ علم وفق وغیرہ بھی اسی کا شعبہ ہو یہ کسی لُغت کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ بعضے مسائل حروف مرکبہ کے ساتھ متعلق ہیں۔ یہاں البتہ کچھ کچھ خصوصیت کسی کسی مخصوص زبان کی رکھی گئی ہو۔ مثلاً اس فن کا ایک یہ مسئلہ ہو کہ عربی لُغت میں جہاں کہیں ایک لفظ میں نون و فا جمع ہوگا اُس سے نقل و حرکت کے معنے سمجھے جاینگے۔ نفی نفر نفد نفذ نفخ نفق نفل نفث نفس نفش وغیر ذالک۔ یا ایک مسئلہ ہو کہ یہ بات غلط مشہور ہے کہ ہر زبان میں مبدء اشتقاق مصدر ہو۔ فارسی زبان میں جتنے صیغے ہیں سب قیاساً ماضی مطلق سے بنتے ہیں۔ غیر قیاسی کا ذکر نہیں۔ جیسے ماضی ایک آمد ہے۔ نون لگا دیجیے اخیر میں مصدر ہوجاوے۔ خواہد اول میں داخل کیجیے مستقبل ہو می بڑھا دیجیے ماضی ناتمام ہ اور بود بڑھا دیجیے ماضی بعید ہو۔ علیٰ ہذ القیاس۔ اردو میں جتنے قیاسی صیغے بنتے ہیں سب امر سے۔ آ امر ہے اس میں جس صیغے کی علامتیں بڑھاتے جائیے وہی صیغہ بنجائیگا اور آ اپنے حال پر رہیگا۔ تو اس قسم کے مسائل بھی بعضے بعضے نظر آئینگے۔ جو کسی مخصوص زبان کے ساتھ علاقہ رکھتے ہیں مگر کم۔

مسائل شروع کرنے کے پیشتر چند مقدمات تمہیدی اور چند قواعد اور چند اصطلاحات کا

پہلے لکھنا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ مسائل کے سمجھنے میں دقت واقع نہ ہو۔ اوّل ہر مفہوم یا موجود ہے یا معدوم یا نہ موجود نہ معدوم موجود و معدوم تو بالبداہتہ معلوم ہی۔ ایسے بدیہی الادراک امور کے تنقیح حقیقت اور تحدید ماہیت میں وقت کا صرف کرنا اور اس کے اجزائے قوامی کا ڈھونڈھنا میں فضول سمجھتا ہُوں۔ یہ مفہوم ہر نادان اور دانا کے نزدیک ایسے روشن ہیں کہ ان کے حدود جو کچھ تجویز کئے جائیں وضاحت میں اس سے گھٹے ہُوئے ہونگے تو لیقیناً ان کی تحدید تحدید بالاخفیٰ ہوگی۔ جو ہر عاقل کے نزدیک لغو ہے۔ ہاں لاموجُود اور لامعدوم میں شاید کسی قدر تردد ہو تو لاموجود اور لامعدوم سے ہماری مراد وُہ امر ہے جو ایک اعتبار سے موجُود ایک اعتبار سے معدوم جس طرح موجوداتِ فرضیہ فرض کیجئے تو موجُود بے فرض کے معدوم مثلاً جسم کے اجزائے تحلیلیہ نصف ثلث ربع۔ جسم کے اجزائے قوامیہ میں بالکل نذارد مگر موجوات متغایرہ اور متمایزہ کے متغائر احکام ان پر جاری نصف اور ربع اور ہر ایک کی حالت جُدا احکام علیحدہ احکام کے تغائر میں کسی نادان کو بھی شبہ نہیں ہوسکتا۔ یا مثلاً اعداد ہیں کہ خارج میں موجُود نہیں۔ مگر اُن کے لئے نفس الامری احکام ثابت عدد زوج یا فرد زوج کے احکام اور فرد کے احکام اور زوج منقسم بمتساوین ہے فرد ایسا نہیں پھر ازواج اور افراد میں بھی متغائر احکام اور متغائر خواص ثابت مثلاً زوج اوّل کو فردِ اوّل کے ساتھ ملایئے تو فرد ثانی حاصل ہو علیٰ ہذالقیاس زوجِ ثانی کو فرد ثانی کے ساتھ ضم کیجئے تو فردِ ثالث بنجائے۔ اِسی طرح الیٰ غیر النہایۃ مثلاً زوج اوّل دو اور فرد اوّل تین ہیں (اِس بنا پر کہ واحد عدد نہیں) دو کو تین کے ساتھ ملایئے پانچ ہوجاویں۔ پانچ فرد ثانی ہی۔ زوج ثانی چار ہے اور فرد ثانی پانچ۔ پانچ کو چار کے ساتھ ملایئے تو نو ہو نو فردِ ثالث ہی۔ یا مثلاً فرد کے خواص میں سے یہ ہی کہ جب زوجِ اوّل کو ہر مرتبہ فرد پر بڑھایئے تو اس کے مابعد کا فردی مرتبہ پیدا ہوجائے اور یہ قاعدہ واحد کے عدد ہونے پر مبنی ہی۔ مثلاً ایک فرد اوّل ہی دو زوج اوّل۔ دو زوج اوّل کو اُس پر بڑھایا

تین ہُوئے۔ یہ فردیت کا مرتبہ ثانی ہے۔ پھر اس مجمُوعہ پر زوج اوّل کو اضافہ کیا پانچ ہُوئے یہ فردیت کا مرتبہ ثالثہ ہے پھر زوج اوّل کو اس مرتبہ پر اضافہ کیا سات حاصل ہُوئے۔ یہ فردیت کا مرتبہ رابعہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ بہرحال ہر عاقل جان سکتا ہے کہ یہ احکام وہمی ہیں جو عدد کے لئے ثابت ہیں اور عدد موجود نہیں۔ ایسے امر کو فلسفہ جدید کی اصطلاح میں ثبوت امکانی۔ وجُود برزخے۔ تحقیق بین بینی۔ غبوبت صغریٰ۔ سکون ضغطی۔ فرض برلی کہتے ہیں۔ وجہ تسمیہ کے منبہ سے معلوم ہوگی۔ ہر موجود کے لئے چار قسم کا وجود سمجھا جاتا ہے۔ وجود عینی۔ وجود ذہنی۔ وجود لفظی۔ وجود خطی میں ہر ایک موجُود کے وجودات چارگانہ سے بطرز جدید بحث کرونگا۔ اور حتی الوسع ہر مسئلہ کو تفصیل اور توضیح کے ساتھ بیان کرونگا۔ مگر

فہم گرد آرید وجاں را رہ دہید
بعد ازاں از شوق پا در رہ نہید

اور اگر ہماری ہی سمجھ کا قصُور مستمع کے نہ سمجھنے کا ذریعہ ہو تو بھی ممکن ہو۔ جیسا ہم مرایائے صوری ومعنوی کے تعاکس وتقابل اور مجہولات طبعی اور مخطورات کونی کے تآلف وتخالف کے ذاتی اور صفاتی وافعالی اقسام اور مناسبات اور تاثیرات کی تحقیق میں عنقریب بیان کرینگے اور یہاں مخاطِب اور مخاطَب میں باعتبار انسانیت ائتلاف نوعی وجنسی موجُود اور اتحاد آلہ ادراک اور توافق حیثیت تفہیمی اور تفہمی کی جہت سے تقابل مرایائے معنوی بھی حاصل ہو۔ ہاں علم مناظر میں اگرچہ تعاکس کے لئے زاویۂ انعکاسی ونوری کی مساوات ضروری سمجھی گئی ہو۔ اور اب یہاں بسبب اتحاد مکانی کے اوّل تو تغایر خطین مسامتین ضروری نہیں ہے تو زاویہ کا بننا معلوم اور اگر ہو تو بسبب اتحاد مراتب مکانی کے حالت انعکاسی اور نوری میں ایک جانب اگر زاویہ ہے تو قائمہ اور ایک جانب حادہ تو انعکاس ہونا دشوار لیکن ہمارے فلسفہ جدید کی تحقیق کے موافق جیسا ہم علم مناظر میں بیان کرینگے۔ تساوی زاویتین

ضروری نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو تجانس صوری میں ہے۔ نہ تجانس معنوی میں بلکہ ہم اسکو ثابت کر دینگے کہ افاضۂ علمی مفیض اور مستفیض دونوں پر بذریعہ قوت اشراقی ہوتا ہی۔ اس کے لئے تحقیق یا تساوی زاویہ شرط نہیں ہاں تقابل اور محاذات اور توجہ بطور سبب کے ہونا چاہئے۔ نہ بطورِ علت موجبہ کے وُہ یہاں حاصل ہو۔ بہرحال بنظر تناسب اتحاد جہت منفاد انعکاس طرفین سے نہ ہو تو ایک طرف سے ضروری ہی اور یہاں نقص اوصافِ کمالی مخاطِب اور مخاطَب دونوں میں موجود۔ اوّل فطرتِ انسانی کیا باعتبار اوصاف جسمی اور کیا باعتبار کمال روحی و عقلی ہر طرح سے ناقص اوصاف جسمی کی حیثیت سے دیکھئے تو کجا خلقتِ آسمان و زمین کجا خلقنا الانسان من ماءٍ مھینٍ اسی لئے ارشاد ہوا لخلق السمٰوات والارض اکبر من خلق الناس ۔ ءانتم اشد خلقا ام السماء ۔ اوصاف روحانی کی حیثیت سے ملاحظہ کیجئے تو کفران اس کی شان قتل الانسان ما اکفرہ ظلوم و جہول ہونیکا اس کے قرآن میں بیان انہ کان ظلوما جہولا ۔ انا عرضنا الامانۃ میں ذرا سی بات تھی آسمان سمجھ گئے زمین سمجھی پہاڑ سمجھے۔ یہ نہ سمجھا کہ یہاں بار امانت کے اُٹھانیکا امر اور حکم نہیں کہ خواہ مخواہ اُٹھانا لازم ہو بلکہ عرض ہی جو اختیار پر مبنی ہی اور پھر انجام کا حال معلوم نہیں اُٹھانے کی قوت اور توفیق اُدھر سے ملے نہ ملے کہ ان الامر کلہ للہ بے سوچے سمجھے اپنے تئیں معرضِ تکلیف میں ڈالدیا۔ آخر ظلوم و جہول کہلایا۔ آسمان زمین پہاڑ سمجھ گئے کہ یہاں عرض ہے امر نہیں۔ فابین ان یحملنھا و اشفقن منھا جہاں امر تھا وہاں نہ انکار کیا نہ عذر ائتیا قالتا اتینا طائعین۔ پہاڑوں کے حق میں اسی سمجھ کی وجہ سے تو ارشاد ہوا ہے کہ لو انزلنا ھذا القرآن علیٰ جبلٍ الیٰ آخرہ

(باقی دارد)

مُرسلہ

مولوی صبیح الدین بی۔ اے دہلوی از علیگڈھ

ترکوں کی معاشرت[1]

مولوی محمد حسن خاں صاحب کے اسم گرامی سے ہمارے اکثر ناظرین اُن کی تصانیف و تراجم کے ذریعہ سے آشنا ہونگے۔ ان کے مترجمہ ناول "ہاجرہ" نے جو کچھ شہرت خصوصاً ان طبقوں میں حاصل کی ہے جو زمانہ حال کے ترکوں کے معاشرتی معاملات سے کچھ دلبستگی رکھتے ہیں۔ وہ محتاجِ بیان نہیں۔ جس کتاب پر ہم آج تنقید کرنے والے ہیں۔ اس کا مُدعا "ہاجرہ" سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ "ہاجرہ" میں بہت سے فرضی اشخاص کو تخیل کے سحر سے لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ اور ان کی رفتار و گفتار سے ترکوں کی معاشرت کا عکس دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اور موجودہ کتاب میں ایک ترک کی رام کہانی اُس کی اپنی زبانی سُنائی ہے۔ جس کے ضمن میں معاشرتی معاملات پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے۔ پہلا طریقہ زیادہ موثر تھا۔ لیکن دُوسرا زیادہ معتبر ہے اور اس قابل ہے۔ کہ اسکو زیادہ غور کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔

ہر ایک مترجم کو اپنے مصنّف کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہمدردی ضرور ہونی چاہیے۔ کیونکہ اگر ہمدردی نہ ہو تو مترجم اصل کا مطلب بجنسہٖ بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مولوی محمد حسن خاں کی صورت میں یہ مشکل آ پڑی ہے کہ اُنہیں اپنے مصنّف سے کافی ہمدردی نہیں۔ وُہ جزوی معاملات میں تو اس سے متفق الرائے ہیں۔ لیکن جن بڑے اصولوں کا خالد خلیل مدعی بنتا ہے۔ اس کے مولوی محمد حسن خاں مخالف ہیں۔ اس مشکل کو شاید مولوی صاحب نے بھی محسوس کیا اور انکو اس بات کی ضرورت لاحق ہوئی کہ ایک مطوّل دیباچہ لکھا جائے جس میں وُہ جی کھول کر دل کا بخار نکال لیں۔ لیکن ہم اپنے ناظرین کو دھوکا نہیں دینا چاہتے

[1] ترکوں کی معاشرت ترجمہ دی ڈائری آف اے ترک مصنفہ خالد خلیل ایم۔ اے۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ جسے محمد حسن خاں صاحب اسسٹنٹ فنانشل پایرنٹ گورنمنٹ آف انڈیا نے موسوم و مع ایک دیباچے کے مرتب کیا ہو اور مطبع مفید عام آگرہ میں چھپوایا۔ قیمت ۱؎ علاوہ محصول ڈاک۔

دیباچے کا نفس کتاب کے ساتھ بلا واسطہ کوئی تعلق نہیں۔ صرف بالواسطہ تعلق ہے۔ مسٹر خالدہ خلیل نے ضمنی طور پر پردے اور آزادی نسوان کے بارے میں کچھ انگریزیت سے ملوث "زہریلے" خیالات ظاہر کئے ہیں۔ جن کے مہلک اثر سے بچانے کے لئے مولوی محمد حسن نے دیباچے کا کڑوا تریاق اپنے ناظرین کو دینا ضروری تصوّر کیا۔ لیکن اُنہوں نے صرف اِسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ مسٹر خالدہ خلیل کی زبان بند کرنے میں بھی کوئی کمی نہیں کی۔ چنانچہ بعض صفحات جن میں ینگ ٹرک پارٹی کی طرف سے سُلطان روم پر حملے کئے گئے تھے۔ بالکل نظر انداز کر دئے گئے۔ اور اس تصرف کے لئے مولوی صاحب نے مسٹر خالدہ خلیل سے معافی بھی نہ مانگی۔ ہمارے خیال میں کسی مترجم کو یہ حق حاصل نہیں۔ کہ مُصنّف کو اپنے مفہوم کے آزادانہ اظہار سے محروم رکھے۔ اور ایسا کرنا محض تنگ خیالی اور تعصب پر مبنی ہی۔ جس سے کوئی معتدبہ فائدہ بھی متصوّر نہیں ہو سکتا۔ اگر مترجم کی آرام طلبی اسے اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ مصنّف کی رائے کا کافی وشافی جواب دے۔ تو بیچارہ مصنّف اس کی سزا کیوں بھگتے؟

ترکوں کی معاشرت کا دیباچہ اہمیت میں اصل کتاب سے گوئے سبقت لیگیا ہی۔ اس لئے ہمارے ریمارکس زیادہ تر اسی کے متعلق ہونگے۔ اصل کتاب کی نسبت صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہی کہ اس کے مطالعہ سے ایک شریف ترک کی عالم طفولیت سے لیکر شباب تک کے حالات مختصر مگر دل کش پیرائے میں معلوم ہو جاتے ہیں۔ طرز بیان نہایت سلیس ہے۔ اور مصنف نے صرف وہی ذاتی حالات تحریر کئے ہیں۔ جو دُوسروں کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے حالات قلمبند کرنے کو شاید بڑی ہُوئی خود پسندی پر محمول کریں۔ لیکن ہماری رائے میں اپنے خیالات سُنانے کے لئے ہمدرد سامع پیدا کرنے کا اس سے بہتر پیرایہ ممکن نہیں۔

دیباچے میں مسئلہ تعلیم و آزادیِ نسوان و اثباتِ پردہ" پر نہایت شرح و بسط

کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ لیکن ہمیں مولوی صاحب معاف فرمائینگے اگر ہم مفصلۂ ذیل سطور میں بعض معاملات پر اُن سے اختلافِ رائے ظاہر کریں۔ ہمارا منشا یہ نہیں کہ انکی رائے کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ صرف اپنے خیالات کا اظہار مقصود ہے۔ مولوی صاحب اُن سے فائدہ اُٹھاتے وقت "خُذ ما صفا و دع ما کدر" والی ضرب المثل پر عمل کر سکتے ہیں حجاب پردے کا سوال اس قدر نازک ہے۔ اور اس پر اس قدر بحث ہو چکی ہے۔ کہ ہم اُس سوتے ہوئے فتنے کو بیدار کرنا نہیں چاہتے۔ علاوہ بریں اس مسئلہ کا ایک مذہبی پہلو بھی ہے۔ جس پر ہمیں اپنے محدود علم کی وجہ سے رائے زنی کا کوئی حق حاصل نہیں۔ بلکہ شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ پردے کے معاونین اسی مذہبی قلعہ کے اندر محصور ہو کر مامون رہ سکتے ہیں۔ ورنہ عقلی دلائل کی ڈھال مخالفین کے تیروں کی تاب نہیں لا سکتی۔

مولوی صاحب بحث شروع کرنے سے پہلے کچھ نو تعلیم یافتہ لوگوں کے بھی منہہ آئے ہیں۔ اور غضب یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے تنزل کا الزام ان بیچاروں کی گردن پر رکھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب دینی بے پروائی ہے۔ کیونکہ دینی لاپرواہی اخلاقی خرابی کی محرک ہوتی ہے۔ اور اخلاقی خرابی تنزل کا پیش خیمہ ہے۔ اس دعویٰ کو اگر غور سے پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بہت سی غلط فہمیوں پر مبنی ہے جن کا رفع کرنا ہم ضروری خیال کرتے ہیں۔ اول تو مولوی صاحب نو تعلیم یافتہ گروہ کو اسلامی دنیا میں اس قدر بڑھا ہوا رتبہ دیتے ہیں۔ جس کے وہ کسی طرح مستحق نہیں ہیں۔ نو تعلیم یافتہ جماعت سے انکی مُراد غالباً ہندوستان کی نو تعلیم یافتہ جماعت ہے۔ کیونکہ مولوی محمد حسن کو دیگر ممالکِ اسلامی کی نو تعلیم یافتہ جماعت سے کما حقہ واقفیت نہیں ہو سکتی۔ اور جہاں تک ہمارے محدود علم کی رسائی ہے۔ وہاں تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی نو تعلیم یافتہ جماعت کی کسی دوسرے اسلامی ملک میں نہ صرف کوئی نظیر ہی نہیں ملتی بلکہ اس کے مماثل جماعت کا وجود بھی عنقا ہے۔ کیونکہ وہاں

ابھی تک مذہب کا کوڑا زبردست ہے۔ اور ہر ایک آزادانہ خیال کے پھوٹتے ہی بیخ کنی کر دی جاتی ہے۔ جسے مولوی محمد حسن دینی لاپرواہی کہتے ہیں۔ اسکی مثالیں ہندوستان سے باہر بہت کم ملتی ہیں۔ خود مسٹر خالد خلیل کا روزنامچہ اس امر پر شاہد ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسلامی ممالک میں ہر ایک مدعیِ اصلاح کو اپنے خیالات کو مذہب کا جامہ پہنانا ضروری ہو جاتا ہے۔ جس کی شہادت ہمیں باب اور اس کے پیروؤں میں مل سکتی ہے۔ اگر اختصار مدنظر نہ ہوتا تو ہم ثابت کر سکتے تھے کہ صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں موجودہ زمانے میں ایک ایسی جماعت کا وجود ممکن ہو سکتا تھا۔ ان واقعات کو ذہن میں رکھ کے ہمارے ناظرین خود قیاس کر سکتے ہیں کہ تعلیم یافتہ جماعت شمار و اثر کے لحاظ سے اسلامی دنیا میں لاشے محض ہے۔ خود مولوی صاحب اس امر کے قائل ہیں کہ تعلیم یافتہ جماعت کے کسی فرد کا جمہور مسلمانان پر زمانہ حال میں کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور ہماری بگڑی کو بنانے والے سب پرانے مکاتب کے تعلیم یافتہ ہیں۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں کے تنزل کا بوجھ کیوں انکی گردن پر رکھا جائے۔ اس جزئی بحث سے قطع نظر کر کے بھی ہم اس بات کے ماننے پر تیار نہیں ہیں کہ دینی بے پرواہی اخلاقی خرابی کی محرک ہوتی ہے۔ گو اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ اخلاقی خرابی تنزل کا باعث ہے۔ گو ہم دینداری کو خود صفاتِ حسنہ میں سب سے ارفع تصور کرتے ہیں۔ لیکن واقعات پر پردہ ڈالنا ہمارا شیوہ نہیں ہیں۔ تاریخ سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مذہب کے علاوہ اور بھی بہت سی قوتیں مثلاً قانون یا حبِ وطن انسان کو دائرۂ اخلاق کے اندر رکھ سکتی ہیں۔ زمانہ حال میں اس کی ایک مثال جاپان ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ انگریزی سوسائٹی اس وقت پایۂ ترقی پر ہے لیکن اس پر دین کا رنگ کسی صورت بھی ہماری سوسائٹی سے زیادہ چڑھا ہوا نہیں۔

انسان کو انسان بنانے والی طاقت دراصل سوسائٹی ہے۔ اور جب سوسائٹی

کے بازو میں زور نہ رہے۔ تب افراد اخلاقی خرابی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مذہب بھی سوسائٹی کے شیرازے کو جمع رکھنے والی ایک طاقت۔ اور اس میں شک نہیں کہ بڑی بھاری طاقت ہے۔ لیکن افراد کے اخلاق کے ساتھ اس کا کوئی بلاواسطہ تعلق نہیں۔ اور بعض صورتوں میں اس کا اثر افراد کے اخلاق پر اس قدر کم ہو جاتا ہے۔ کہ اس کا تمیز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ ہمیں اس میں بھی تامل ہو کہ آجکل کے مسلمانوں کے اخلاق زمانہ گذشتہ کے مسلمانوں کے اخلاق کی نسبت زیادہ خراب ہیں۔ اور اس لئے انکے تنزل کا باعث [illegible] اخلاقی خرابی ہو۔ ہمارا خیال ہو کہ مسلمانوں کے تنزل کے اسباب ڈھونڈھنے کے لئے ہمیں زیادہ غائر نظر ڈالنی چاہئے۔ اور ان امراض کو ڈھونڈھنا چاہئے جو شروع سے خفیہ طور پر مسلمانوں کے اعضائے رئیسہ کو گھن کی طرح کھا رہے تھے۔ لیکن جنہوں نے اپنا مہلک کام تیرہ سو سال کے بعد پورا کیا ہو۔ قرون اولیٰ کو چھوڑ کر جب کہ نئے مذہب کا جوش اور فتوحات کا بخار مسلمانوں کو رو کی طرح بہائے لئے جاتا تھا۔ اور ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتا تھا۔ اگر ہم اور قرنوں پر غور سے نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا۔ کہ اخلاقی خرابیوں کا یہ داغ مسلمانوں کی سوسائٹی کے چہرے کو ہمیشہ بدنما بناتا رہا ہے۔ بلکہ شاید یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ مسلمانوں کی اخلاقی حالت (اگر ہم اس لفظ کے محدود معنی لیں) اس وقت آج سے پانچ چھ صدی پہلے کی نسبت بہت بہتر ہے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ آج سے پانچ چھ صدی پہلے مسلمان معراج ترقی پر تھے۔ مولوی محمد حسن نے اپنے اس دعویٰ کے اثبات میں ایک اور بھی چونکا دینے والا خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ یہ کہ مغرب کی اعلیٰ تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہے۔ اگر اس کہنے سے انکا یہ منشا ہو کہ مغرب کی اعلیٰ تہذیب ان عالمگیر اصولوں پر مبنی ہے جن پر کہ تمام دنیا کی تہذیبیں مبنی رہی ہیں اور رہینگی۔ اور از انجملہ اسلامی تہذیب بھی مبنی تھی۔ تو تو ہمیں اس قول کے تسلیم کر لینے سے کوئی انکار نہیں۔ ورنہ بصورت دیگر ہم مغربی تہذیب میں اسلامی تہذیب کی کوئی خاص جھلک نہیں پاتے۔ اور اس قسم کا دعویٰ ہر ایک مذہب کا پیرو اپنے مذہب کے حق میں کر سکتا ہے۔

پردے کی تائید میں جو عقلی دلایل پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک مردوں اور عورتوں کے حقوق کی مساوات سے تعلق رکھتی ہے۔ اور جیساکہ ہمارے ناظرین سمجھ گئے ہونگے۔ مولوی محمد حسین مساوات حقوق کے سخت خلاف ہیں۔ ہم خود بھی اس مسئلہ کو ناقابل عمل ہونے کی وجہ سے مبنی برحق خیال نہیں کرتے۔ تاہم ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ مولوی صاحب کی منطق میں لغزشیں ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مرد و عورت ایک کل کے دو پُرزے ہیں۔ اور ایک کی رفتار دوسرے کی تائید یا اتباع میں ضرور ہونی چاہئے ورنہ کل نہیں چلیگی۔ ہمیں اس اصُول متعارفہ کے ماننے میں کوئی کلام نہیں۔ کیونکہ یہ کسی ثبوت کا محتاج نہیں۔ ہمارا صرف یہ دعویٰ ہے کہ ایک کی رفتار دوسرے کی تائید میں ہونی چاہئے۔ کل کے چلانے کے لئے حاکم و محکوم کا سا اتباع ضروری نہیں۔ لیکن مولوی صاحب شاید اس دعویٰ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حامیان آزادی نسوان میں سے جو لوگ کچھ تھوڑی بہت عقل رکھتے ہیں وہ ہرگز یہ نہیں کہتے کہ عورتوں کو شتر بے مُہار کی طرح چھوڑ دینا چاہئے۔ ان کا منشا یہ ہے کہ عورتوں کو ان کے دماغی اور جسمانی قویٰ کی نشو و نما سے نہیں روکنا چاہئے۔ بشرطیکہ وہ جائز اور مناسب حدود کے اندر ہو۔ مردوں نے بعض بیجا رکاوٹیں عورتوں کی ترقی کی راہ میں ڈال دی ہیں جس کے وہ کسی طرح مجاز نہ تھے۔ ہاں "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس"۔ اگر اس مثل کو کوئی شخص سفر ہستی میں اپنا راہ نما بنائے تو دوسری بات ہے۔ ہر ایک حق پسند شخص کو یہ خدا لگتی بات بھائیگی کہ مردوں کو اپنے حقوق کے استعمال میں نرمی سے کام لینا چاہئے۔ اور عورتوں کی بیکس حالت کو دھیان میں لاکر ذرا اپنی عنان حکومت کو ڈھیل دینا چاہئے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ پھندا ہماری بے زبان عورتوں کا گلا بالکل نہ گھونٹ دے۔ اور اس کے ساتھ ہماری آئندہ نسلوں کو بھی مُردہ بشکل زندہ نہ بنا دے۔

مولوی صاحب زنانہ مدارس کے بھی خلاف ہیں۔ اور اپنے دعویٰ کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اندلس و مصر و بغداد وغیرہ میں عورتوں کے مدارس نہ تھے۔ حالانکہ

مسلمانوں کی اس زمانہ کی حیرت انگیز ترقی سے کسی کو انکار نہیں - اول تو یہ کوئی دلیل ہی نہیں کیونکہ جس زمانے میں مسلمان برسر ترقی تھے - اس زمانے میں عورتوں کے مدارس نہ تھے اس لئے اس زمانے میں بھی عورتوں کے مدارس کو ترقی کا ایک ذریعہ تصور نہیں کرنا چاہیئے - یہ دلیل بالکل ایسی ہی ہو جیسا کہ ہم کہیں کہ جس زمانے میں کونین دریافت نہیں ہوئی تھی - اس زمانے میں بخار سے اموات کسی صورت زمانہ حال کی نسبت زیادہ نہ ہوتی تھیں - بلکہ اگر عامہ خلائق کے عقیدے کو درست مانا جائے تو اس زمانے کے لوگوں کی صحت آجکل کے لوگوں کی نسبت بدرجہا بہتر تھی - اس لئے کونین نے بنی نوع انسان کو کچھ فائدہ نہیں پہنچایا - اور اس کو بخار کا تریاق کہنا سراسر غلطی ہے - ہم یہ کب کہتے ہیں کہ ایک زنانہ مدارس ہی ترقی کا ذریعہ ہیں - یا کونین ہی بخار کا علاج ہے - ہمارا تو صرف یہ دعویٰ ہے کہ جیسے کونین بخار کے علاج کا ایک بہت موثر ذریعہ ہے - ویسے ہی زنانہ مدارس قومی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ ہیں لیکن شاید ہم غلطی پر ہیں - ہمیں زنانہ مدارس کے بدلے تعلیم نسواں کہنا چاہیئے تھا - اور مولوی محمد حسن کے جواب میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں - کہ چونکہ بہت سے غور و فکر کے بعد روئے زمین کے متمدنوں نے مدارس کے طریقہ ہی کو اشاعت تعلیم کا بہترین طریقہ قرار دیا ہے - اس لئے تعلیم نسوان کے لئے زنانہ مدارس کا ہونا لابدی ہو - ہر ایک زمانے کا طریق عمل جداگانہ ہوتا ہو - اندلس و مصر کا طریق عمل اس زمانے کی کوائف و حالات کے مطابق تھا لیکن اس زمانے کی کوائف و حالات اس امر کی مقتضی ہیں کہ مدارس قائم کئے جائیں اور لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو مغربی اصول پر تعلیم دیجائے -

مولوی صاحب نے لڑکیوں کے لئے جو نصاب تعلیم تجویز کیا ہو وہ ایسا ہی ہو - جیسا کہ ان جیسے تنگ خیالات کے شخص سے توقع ہو سکتی تھی - ہمارا منشا مصنف کی دل شکنی نہیں اس لئے ان کے نصاب سے تعرض نہیں کرتے - مگر ہم نہایت ادب سے سوال کرتے ہیں کہ انہیں انگریز عورتوں کی استعداد علمی پر حرف رکھنے

کی کیا ضرورت تھی۔ وُہ فرماتے ہیں کہ انکا نصاب یوروپین زنانہ مدارس کے نصاب کے بالکل مطابق ہو۔ لیکن انہیں یہ موٹی سی بات نہ سُوجھی۔ کہ انگریزی و اردو میں کیسا آسمان و زمین کا فرق ہو۔ جو شخص انگریزی جانتا ہے وُہ علم کے ایک امنتہی خزانے کی کُنجی اپنے ہاتھ میں رکھتا ہو۔ برخلاف اس کے اُردو دان کی مثال ایک تشنہ کام کی ہو جو ہاتھ میں ایک خالی کٹورہ لئے پانی کی تلاش میں پھرتا ہو۔ ہم اپنے علم ادب کی بے وقعتی کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن حق پسندی اس امر پر مجبور کرتی ہو کہ انگریزی کے مقابلے میں اپنی زبان و ادب کا ان الفاظ ہی میں تذکرہ کریں۔ علاوہ بریں موسیقی و مصوری جو یوروپین زنانہ مدارس کے نصاب تعلیم کا جزو اعظم ہیں۔ مولوی صاحب کے نصاب تعلیم سے بالکل خارج کر دیئے گئے ہیں۔ غالباً یہ فروگذاشت سہواً نہیں ہوئی۔ مولوی صاحب جیسے مُقدس بزرگ کے لئے ان مزخرفات کا تذکرہ کرنا کسر شان کا موجب تھا۔

"ترکوں کی مُعاشرت" کے دیباچے میں مصنف نے جگہ جگہ اپنے اقوال کی تائید میں انگریز اہل الرائے کے اقوال نقل کئے ہیں۔ مگر ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی۔ کہ ان میں سے اکثر اقوال ایسے لوگوں کے ہیں جنہیں ہم "اہل الرائے" ماننے پر تیار نہیں۔ ان اقوال کا بیشتر حصہ اخباروں کے "دلچسپ معلومات" کے کالموں سے مقتبس ہے جو رطب و یابس کی بھرتی کے لئے ضرب المثل ہیں۔ بعض ان لوگوں کے خیالات ہیں جن کا دماغ عجیب عجیب خیالات سے پُر رہتا ہے۔ اور جو صائب الرائے کے لوگوں کے لئے ہمیشہ اضحوکہ بے رہتے ہیں۔ بعض چند مذہبی مصنفوں کی تحریروں کے جستہ جستہ فقرات ہیں۔ جنہیں اپنے مطلب کا پاکر سیاق عبارت کو ذہن میں رکھے بغیر لے لیا گیا ہے۔ اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کی کہ مُصنف نے یہ بات کیوں لکھی ہو۔ اور اس صاف گوئی سے اس کا کیا مدعا ہو۔ اس آخری قسم کے اقتباسات کو دیکھ کر وُہ مثل یاد آتی ہو کہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ کڑوا کڑوا تھو۔ حسب منشا اقتباسات ڈھونڈھنے کوئی مشکل کام نہیں۔ اور

اگر یہی کسی قول کی صداقت کا معیار ہی تو ہمارا دعویٰ ہی کہ ہم مولوی محمد حسن کے ہر ایک قول کی تردید میں اس سے زیادہ اقتباسات پیش کر سکتے ہیں۔ جتنے کہ انہوں نے اس کی تائید میں پیش کیے ہیں۔

آخر میں ہم اتنا اور کہنا چاہتے ہیں۔ کہ ہم مولوی صاحب موصوف سے بہت سے اہم معاملات میں متفق الرائے بھی ہیں۔ اور جس نیک نیتی سے انہوں نے ہر ایک معاملہ پر بحث کرنے کی کوشش کی ہی۔ اس کی داد دیتے ہیں۔ انکی غلطیاں زیادہ تر ان تعصبات پر مبنی ہیں جو ہمیشہ سے انکے خیالات میں جاگزین رہے ہیں۔ اور جن کے تصرف سے شاید ہی کوئی انسان بچا ہوا ہوتا ہے۔ ہماری مراد ان آرا سے ہی جنہیں لارڈ بیکن نے (Idols) یعنی بتوں کے نام سے تعبیر کیا ہی۔ جنہیں ہر ایک شخص اپنے صنم خانہ دل میں پاتا ہے۔ اور کم و بیش انکا مطیع ہوتا ہے۔

"ترکوں کی معاشرت" اور اسکا دیباچہ دونوں سلیس و صاف اردو میں لکھے گئے ہیں۔ اور ہم مولوی محمد حسن کو انکے عمدہ اور پسندیدہ اسلوب پر مبارکباد دیتے ہیں۔ جس خوبی سے مولویصاحب نے انگریزی ترکیبوں کو ہندوستانی لباس پہنایا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ اصل کتاب کا حجم ۱۹۲ صفحہ اور دیباچے کا حجم ۴۴ صفحہ ہے۔ لکھائی چھپائی کی نفاست کی مطبع مفید عام آگرہ کا نام ٹائیٹل پیج پر ہونا کافی ضمانت ہی۔ کاغذ بھی اچھا ہے۔ اور سبز رنگ کا بیرونی ٹائیٹل پیج بہت روپہلی نقوش ہیں۔ بالخصوص دلکش ہے۔ اور آرٹ پریس کلکتہ کے نفیس کام کی بخوبی شہادت دیتا ہے +

محمد سعید

عالم ہو تو اپنے علم کو عمل میں لاؤ۔ اور اس سے فائدہ اٹھاؤ +
جاہل ہو تو اپنی جہالت کا اقرار کرو۔ کیونکہ کاٹھ کی ہنڈیا ایک ہی دفعہ چڑھے گی +

اگلے وقتوں کی وفاداری

(سترھویں صدی عیسوی کی ایک انگریزی خاتون کی آپ بیتی کہانی اُسی کی زبانی)

اب جو بڑھاپے میں میں اپنی عمر کے سترھویں سال کو یاد کرتی ہوں تو مجھ کو یاد آتا ہے کہ اُس وقت تک سوائے سیدھی سادی باتوں کے مجھ کو کسی چیز کی خبر نہ تھی - اور مجھ کو فطرت کے اُس حُسن میں جو جنگلوں اور پہاڑوں کے درمیان ہمارے مکان کے ارد گرد کثرت سے موجود تھا کافی سرمایہ مسرت مل جایا کرتا تھا - اگرچہ اب میں ضعیف ہو گئی ہوں مگر میں بھولی نہیں اور جب تک میری آنکھیں آخری نیند سے بند نہ ہو جائینگی میں ہمیشہ اپنے تصور میں اپنے باپ دادا کا وُہ مکان دیکھتی رہونگی - میرے ایام شباب میں یہ مکان سبزہ زار کے ایک بلند قطعے پر واقع تھا - بہت سے درختوں کے پتوں میں سے اس کے سُرخ اینٹ کے بُرج اور محرابیں نظر آیا کرتی تھیں - اور اس کے صحن اور روشیں بھینی بھینی خوشبو والے پھولوں سے آراستہ تھیں اس سے زندگی بسر کرنے کے لئے اس سے زیادہ خوشنما مقام کوئی کیا ہو گا ؟ اس میں میں پیدا ہوئی اور اسی میں میں نے اپنی عمر کا حصہ نشو و نما ایسی خوشی سے بسر کیا جیسے سبزے میں کوئی پھول ہو یا جیسے کوئی پرندہ ہو کر گاتا ہے مگر نہیں جانتا کہ میرا دل شوق زمزمہ پیرائی سے کیونکر پُر ہے - یہیں میرے بچپن کے دوست آیا کرتے تھے - اور ہمارے ملنسار پڑوسی جو میرے والدین کی اُنکی شریفانہ انسانیت اور ناموری کی وجہ سے عزت کرتے تھے ہم سے ملنے آیا کرتے تھے - کوئی وجہ نہ تھی کہ میں جن چیزوں کو جانتی نہ تھی - اُنکی آرزو کرتی یا اپنے وطن سے زیادہ خوشنما نظاروں کی تمنا کرتی -

ہم شہروں سے بہت دُور رہتے تھے اور ہم کو دُور کے لوگوں کے حالات بھی

معلوم نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ ہم اپنے ہی معاملات میں مصروف رہتے تھے۔ جو غریب محتاج لوگ ہمارے دروازے آجاتے تھے ان کی ضرورتیں پوری کرنے میں اور جو بیمار اور بھوکے ہمارے پاس مدد اور آرام طلب کرنے کو آتے تھے۔ اُن کی خبر لینے میں ہمارا دن کٹ جاتا تھا۔ اور میرا تو یہ حال تھا کہ مَیں زندگی کی روشنی اور خوشی اور ماں باپ کی محبت کے سوا اَور کسی چیز کا دھیان ہی نہ کرتی تھی۔ اور اگر کوئی خیال تھا تو یہ تھا کہ جو دکھیا اور بیکس لوگ مجھ جیسی دل کی اور جسم کی راحت سے محروم ہیں۔ اُنکی امداد کے لئے تیار رہوں۔

شاید بہت سے لوگ میری اس طرزِ زندگی کو بے رونق اور بے تفریح سمجھتے ہونگے مگر حقیقت اس کے خلاف تھی۔ مَیں بالکل خوش و خرم تھی۔ اور اپنے زمانے کی اُن دوشیزہ لڑکیوں پر بالکل رشک نہیں کرتی تھی۔ جو گاڑیوں میں سوار ہو کر لندن جایا کرتی تھیں اور عجیب عجیب چیزیں دیکھا کرتی تھیں۔ جنکو دیکھ کر وُہ حیرت زدہ ہوا کرتی تھیں۔ اگر وہ اپنے گھر پر ہی رہتیں تو میری عاجزانہ رائے میں تو زیادہ صبر و قناعت رکھتیں۔

کبھی کبھی کوئی ایسا امیر ہمارے ہاں ملنے آجایا کرتا تھا جس نے بڑے بڑے شہر دیکھے ہوتے تھے اور وہاں کے باشندوں سے بہت کچھ باتیں کی ہوتی تھیں۔ اور اس بڑی کاری کی بڑی دُنیا میں جو عام رواج معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کا ذکر مجھ کو نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا تھا۔ مَیں نے تو کبھی اس دُنیا کو دیکھنے کی آرزو ہی نہیں کی۔

لیکن ان تمام باتوں کا اُس بات سے کچھ تعلق نہیں جو مجھ کو بیان کرنی ہے۔ کیونکہ بہترین زندگی دُنیوی رسم و رواج کی زندگی نہیں ہے۔ میرے خیال میں عورت کے واسطے تو حقیقت میں ایک ہی زندگی ہے اور وُہ زندگی محبت ہے۔ کیونکہ جب کسی دوشیزہ کے دل میں محبت آتی ہے وُہ اُس وقت پہلے پہل زندگی میں داخل ہوتی ہے اور جب محبت چلی جاتی ہے زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اور وُہ اپنے آپ کا ایک ہمزاد رہ جاتی ہے اور گذرے ہوئے لُطف کی یاد میں اپنے دن کاٹتی ہے۔ اور اس امر کی گواہی مَیں دیتی ہوں۔ اسی لئے اگر

میں طاقتِ گویائی رکھتی ہوں۔ میں اُس عالی منش اور با اخلاق شریف مرد کی اعلیٰ صفات اور بے نظیر نیکیوں کی شہادت دیتی ہوں جس کی وفا اور حمیت کی قدر میں مرتے دم تک کرتی رہونگی اور جس کے روبرو قبر کے دروازے سے گذر کر میں خالص وفاداری کے ساتھ حاضر ہونے کی امید کرتی ہوں۔

جب پہلے پہل ہم ملے تو موسم نہایت ہی پیارا تھا۔ پُر نزاکت اپریل گذر کر پُر حسن مئی آرہا تھا۔ سہ پہر کو دھوپ کھل رہی تھی اور پرندے بگار رہے تھے کہ میرا باپ بہادر پُرسی کو ہمراہ لئے شکار سے واپس آیا۔ اُس وقت کی وہ تصویر اب تک برابر میرے دھیان میں ہے۔ سجیلا جوان تھا۔ پیشانی فراخ اور بہادرانہ تھی جس سے موسم بہار کی روشنی منعکس ہوتی تھی۔ جب اُس نے اپنے گھوڑے کی باگ تھامی تو نہایت خوشگوار تبسم کے ساتھ ہم کو سلام کیا۔

میرے باپ نے کہا "مارجوری۔ اپنی ماں کے پاس جاؤ اور کہو کہ یہ شریف زادہ کچھ دنوں ہمارے ہاں ٹھہر کر ہم کو اپنی میزبانی کی عزت بخشیگا۔ کُتب خانے میں چاندی کی صُراحی میں شراب اور اُس کے ساتھ کے پیالے لے آؤ۔ اور تمہیں ہم کو شراب پلاؤ۔ ہم پیاس کے مارے بے اوسان ہو رہے ہیں اور تم چُست و چالاک ہو"۔ میں فوراً اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کے لئے گئی اور میرے باپ نے اپنے مہمان کو گھوڑے سے اُتارا۔ ابھی نوکر گھوڑوں کو کپڑے سے لئے جا رہے تھے کہ میں صُراحی اور پیالے ایک خان میں رکھ کر جھٹ پٹ کُتب خانے میں جا پہنچی اور اپنے باپ اور شریف پرسی کی خدمت کے لئے اُنکے حکم کی منتظر کھڑی ہو گئی۔ پرسی بولا "حسین مارجوری۔ تمہارا نام مارجوری ہے نہ؟ اگر تمہاری مرضی ہو تو مجھ کو اجازت دو کہ میں تم کو تمہارے بوجھ سے سبکدوش کر دوں"۔ اور کورنش کر کے اُس نے وہ خوان میرے ہاتھ سے لیا اور میز پر رکھدیا۔ پھر ایک نہایت شگفتہ تبسم کے ساتھ جو ہمیشہ کے لئے مجھے یاد ہے۔ میرے باپ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "سر ریجی نالڈ۔ اگر آپ کی بیٹی ہماری گستاخی معاف کرے تو آؤ ہم اس کا جامِ صحت پیتے ہیں"۔ میرے باپ نے

جواب دیا۔ "ضرور۔ بلکہ اس لڑکی کو تو اس عزت پر ناز کرنا چاہیئے۔ آؤ مارجوری آجاؤ۔ حجاب کو کسی اور موقع کے لئے رہنے دو۔ اچھا جارج پرسی اب جامِ صحت"۔ پرسی نہایت رنگیلے پن سے بولا۔ "مارجوری لزلی کا جامِ صحت! جو عورتوں میں سب سے حسین ہے"۔ اور میری طرف دیکھ کر اس قدر لطف آمیز التفات سے مجھ کو سلام کیا کہ میں کھسیانی سی ہوگئی۔ اور یہی غنیمت سمجھا کہ اس کمرے سے چلی جاؤں۔ میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مگر جلد ہی میری ماں نے مجھ کو بلا بھیجا اور مہمان کے آرام کے متعلق کئی انتظام میرے سپرد کئے۔ میں نے نہایت احتیاط اور سرعت کے ساتھ یہ سب انتظام کر دیئے۔

تعجب یہ ہے کہ پرسی کا موجود ہونا میرے دل کے چین اور راحت کے لئے روز بروز زیادہ ہی زیادہ ضروری ہوتا چلا گیا۔ حالانکہ میں اور میری ماں اُس سے بہت کم ملتے تھے۔ کیونکہ دن بھر وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ادھر اُدھر پھرتا رہتا تھا۔ گویا کسی ضروری کام میں مصروف ہے۔ اور جب شام کو واپس آتا تھا تو وہ اکثر اوقات میرے باپ کے ساتھ کتب خانے میں دروازے بند کر کے باتیں کرتا رہتا تھا۔ میری ماں نے ایک دفعہ مجھ سے کہا "میرا خیال یہ ہے کہ یہ شخص بادشاہ کی طرف سے کوئی خفیہ خدمت انجام دے رہا ہے"۔ یہ سُنکر میرے جسم کا خون آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے لگا۔ اور کچھ دیر تک میں اس طرح کھڑی رہی جس طرح کوئی یکایک گونگا ہو جائے۔ کیونکہ اگرچہ دیہات کے اس الگ تھلگ حصے میں جس میں ہم رہتے تھے کچھ بہت شورش نہیں ہوئی تھی لیکن سلطنت کی خانہ جنگی کی افواہیں ہم کو بھی پہنچ چکی تھیں۔ اور یہ سُنکر ہم کو سخت رنج ہوا تھا کہ حضرت اقدس شاہ چارلز کے تعاقب میں اُس کے باغی دشمن جگہ جگہ اس طرح پھرتے ہیں جس طرح کسی ہرن کے پیچھے شکاری پھرتا ہو۔ میرا باپ جو بادشاہ کا وفادار خیر خواہ تھا اکثر دُعا کیا کرتا تھا کہ بادشاہ کبھی میرے غریب خانے کو بھی عزت بخشیں تاکہ اگر ضرورت ہو تو میں اُس کا پُشت و پناہ بنوں اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ذاتِ خود اُنکی حفاظت کروں۔ اپنے

باپ کی اِس بہادرانہ خیر خواہی کی مَیں بہت تعظیم کرتی تھی۔ لیکن مَیں وُہ آرزو بادشاہ کی نسبت نہیں کرتی تھی جو میرا باپ کرتا تھا کیونکہ مَیں کمزور اور ڈرپوک طبیعت والی ہُوں اور امن کے آرام کو پسند کرتی ہُوں۔ اِسی لئے جب میری ماں نے کہا کہ میری رائے میں یہ شخص بادشاہ کی کوئی خفیہ خدمت انجام دے رہا ہو تو مَیں خوف کے مارے حیرت زدہ سی ہوگئی۔ کیونکہ مَیں جانتی تھی کہ خفیہ خدمت میں خطرہ اور بسا اوقات موت تک کا احتمال ہوتا ہے۔ اِس بات کے بعد میں پردیسی کو پہلے سے زیادہ شوق کے ساتھ دیکھنے لگی۔ اور جب مَیں اُس سے بات کیا کرتی تھی تو میری آواز کانپ جاتی تھی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ مَیں نے دیکھا بھی نہیں اور وُہ میرے پاس آکھڑا ہوا۔ وہ بولا حسین ہارجوری! تمہیں کوئی تکلیف ہے؟ تمہارے رخسارے پہلے کی نسبت زرد ہو گئے۔ اور تمہاری آواز میں وُہ پہلی سی مسرت نہیں ہے۔ مہربان خاتون مجھ کو بتاؤ تو۔ اگرچہ مَیں کسی قابل نہیں لیکن کہیں مَیں نے ہی تو تم کو آزردہ نہیں کردیا۔ اگر مجھ سے نادانستہ کوئی قصور ہو گیا ہو تو مَیں اُس کی پُوری تلافی کرنے کو تیار ہُوں۔ ذرا مُسکراؤ اور مجھ سے کہدو کہ تمہارے جانے سے پہلے ہم نے تم کو معاف کیا۔" مَیں نے کہا۔ "ہائے افسوس۔ آپ اپنے چلے جانے کا ذکر کرتے ہیں؟" اس سے زیادہ مَیں کچھ نہ کہہ سکی۔ میرا دل ایک عجب قسم کے بوجھ سے دب گیا۔ اُس نے ایک گونہ فخر کے ساتھ اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا اور اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ بولا "ہاں مَیں اپنے جانے کا ذکر کرتا ہوں۔ اور تم جو ایک شریف لڑکی ہو۔ میرے جانے کو مُبارک سمجھوگی۔ کہو خُدا حافظ و ناصر! حسین ہارجوری کل شب کو بادشاہ پاس کے جنگل میں سے گذریگا۔ اور مَیں اور چند چیدہ چیدہ سوار جا ملیں گے اور بادشاہ کے ساتھ ہوکر اُس کو سب سے نزدیک بندرگاہ تک پہنچا دینگے۔" اس کے بعد اُس کی آواز یکایک دھیمی ہوگئی۔ بولا "تم سے رخصت ہونے سے پیشتر مَیں تم سے ایک ایسی بات کا ذکر کرنا چاہتا تھا جس کا مجھ سے بہت ہی گہرا تعلق ہے۔ اگرچہ مَیں ایک بہت خطرناک کام پر جارہا ہُوں۔ ساتھ ہی مجھ کو تمہاری آزردگی کا

بھی خوف ہو۔ ہیں! آنسو بہاتی ہو؟ پیاری! تم روتی ہو! اور اس رونے کا باعث میں ہوں؟"

واقعی آنسو میرے بس میں نہ رہے اور ٹپ ٹپ بہنے لگے۔ لیکن باہر کے زینے میں اپنے باپ کی آہٹ سنکر میں سخت شرمندہ ہوکر اٹھی۔ میں یہ بھی نہ جانتی تھی کہ میں یہ کیا کر رہی ہوں اور جلدی سے اس کمرے سے نکل کر ایک دوسرے کمرے میں جا چھپی۔ اور دیر تک روتی رہی۔ تنہائی میں دیر تک میں صبر اور تسلیم کے لئے دعا کرتی رہی۔ روتے روتے جو میں نے آنکھیں اٹھائیں تو جناب مسیح اور صلیب کی تصویر پر نگاہ پڑی اور اس باصبر غمزدہ چہرے پر مجھ کو ایک تبسم نظر آیا۔ یہ چند لفظ جو میں نے کسی زمانے میں پڑھے تھے مجھ کو یاد آئے۔ "جو کوئی محبت کرتا ہے اس کو اپنے محبوب کے لئے تمام سختیوں اور تلخیوں سے گلے ملنا پڑتا ہے"۔ اس فقرے کو اپنی تسکین خاطر کے لئے میں نے بار بار دہرایا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اٹھی۔ دل میں ایک عجیب سکون تھا مگر ایک ویرانی بھی تھی

اتنے میں ایک لڑکا آیا اور ایک سربمہر لفافہ مجھ کو دیا۔ اور خاموشی کی ہدایت کے طور پر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر فوراً چل دیا اور میں اس سے کچھ پوچھ بھی نہ سکی۔ میں نے لفافہ کھولا۔ خط میں یہ لکھا تھا۔ "یہ خط مارجوری لزلی کے حسین ہاتھوں کے لئے ہے۔ التجا یہ ہے کہ وہ اس شخص کے حال پر رحم کھائے جو شاید عنقریب اس کے چہرے کے نور سے ہمیشہ کے لئے ہی محروم ہو جائے۔ اور آج شب کو جب سر ریجی نالڈ اور انکی بیوی سو جائیں تو بڑے کمرے کے مشرقی حصے میں اس جگہ آجائے جہاں زرہ لٹکی ہوئی ہے۔ تاکہ میں وفا شعار عاشقوں کے دستور کے مطابق اس سے رخصت ہو لوں۔

جارج پرسی"

کسی آئندہ حالت میں اگر اس قسم کا کوئی خط میرے پاس آتا تو میں سہم جاتی۔ کیونکہ اس طرح چھپ چھپ کر کسی سے ملنا میرے کنوارپن کے خیالات کے بالکل خلاف تھا۔ لیکن جب

میں نے غور کیا کہ واقعی شاید پھر مجھ کو بہادر پرنس کو دیکھنا کبھی نصیب ہی نہ ہو۔ تو میری عقل میری محبت سے مغلوب ہو گئی۔ اور میری روح کو نہایت مسرت ہوئی کہ ایک ایسے بہادر شریف آدمی نے اپنے آپ کو میرا عاشق بیان کیا ہے۔ نہایت بیتابی کے ساتھ میں نے شام کی وہ گھڑیاں گن گن کر کاٹیں۔ آخر گھر کے سب لوگوں کے سونے کا وقت آیا۔ اُس وقت میری ماں نے کہا "مارجوری تم کو نیند اچھی طرح بھی آتی ہے؟ یا تم کو کوئی ایسا مرض ہے جس کا تم ذکر نہیں کرتیں؟ تمہارے رخسارے بخار والوں کے سے ہو رہے ہیں آنکھیں ایسی چمکتی ہیں کہ تندرستی میں نہیں چمکتیں۔ تم مجھ سے اپنی تکلیف کو چھپاتی ہو؟ مجھ سے بڑھ کر تمہارا دوست کون ہے؟" اس پر مجھ کو سخت رنج ہوا اور بڑی شرم آئی کیونکہ اپنی زندگی میں پہلی دفعہ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی ماں سے آنکھ نہیں ملا سکتی۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا صرف یہی کہا "نہیں امّاں جان میری طرف سے آپ فکر نہ کریں مجھ کو نیند اچھی طرح آتی ہے اور کوئی تکلیف نہیں"۔ اس پر میری ماں نے ایک آہ کی اور خاموش ہو رہی۔

جب میری ماں چلی گئی تو میں اپنی خوابگاہ میں گئی۔ مجھ کو سخت ندامت ہوئی۔ کہ ہائے یہ کس قدر بیرحمی کی بات ہے کہ میں صرف چند ہفتے میں ایک اجنبی آدمی کو اپنی پیاری ماں سے بھی زیادہ چاہنے لگ گئی۔ اسی افسوس اور حیرت میں اپنی ماں کے کمرے کے دروازے کے آگے ذرا ٹھہری اور کواڑوں کو چومنے لگی اور رو رو کر دل ہی دل میں اپنی ماں سے معافی مانگنے لگی۔ مگر میں اپنے ارادے سے باز نہ آئی۔ میرا دل بہت دھڑک رہا تھا اور میں اپنے کمرے میں بیٹھی کان لگائے سن رہی تھی کہ زینے پر میرے باپ کے پاؤں کی آہٹ کب سنائی دیتی ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنی خوابگاہ کو جا رہے ہیں۔ آخرکار آہٹ سنائی دی۔ اور خوابگاہ کے دروازے کے کھولنے اور بند کرنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر اور ٹھہر کر میں اپنے کمرے سے روانہ ہوئی۔ میں سفید رنگ کے

نرم اور بے آواز کپڑے پہنے ہوئے چپکے چپکے تاریک راستوں سے ہوتی ہوئی مشرقی کمرے میں پہنچی۔ منقش کھڑکیوں میں سے چاندنی کی شعاعیں چمکتی تھیں۔ اور ان شعاعوں سے اُس پرانی زرہ پر جو وہاں لٹکی ہوئی تھی۔ عجب قسم کے سائے پڑتے تھے۔ بہادر پرسی کی بانکی صورت سامنے دکھائی دی۔ اور جب میں اس کے قریب پہنچی تو وہ فوراً ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ بولا "شریف مارجوری تم پر بی بی مریم اور فرشتوں کی برکت ہو۔ تم نے مجھ پر بڑی مہربانی کی۔ میں تو تم سے اس طرح باتیں کرتا ہوں جس طرح کوئی بستر مرگ پر پڑا ہوا اپنے محبوب سے باتیں کرتا ہے۔ تم جان گئی ہو گی کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ تم نے میری نگاہوں میں میرے اقبالِ جرمِ محبت کو پڑھ لیا ہے اور افسوس کہ تم ناراض ہو گئیں۔ لیکن میں ساری حقیقت تم سے کہتا ہوں۔ خدا کی مرضی یہ ہے کہ محبت اور موت میری زندگی پر آپس میں جھگڑیں۔ اور پاسِ آبرو جو سب چیزوں سے بڑھکر ہے مجھ کو قبر کی طرف بلاتا ہے۔ حالانکہ محبت مجھ کو تمہاری آغوش کی طرف پکارتی ہے۔ مارجوری میں تم پر مرتا ہوں۔ اپنے باوفا دل کی ساری طاقت اور صداقت کے ساتھ تم پر نثار ہوں۔ مگر تم سے کہتا ہوں کہ مجھ سے نفرت کرو اور مجھ کو بھول جاؤ اور معاف کر دو۔ پھر اُس نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر چوما۔ اور کہا "خدا کرے تم کو مجھ سے محبت نہ ہو! لیکن مجھ کو بتاؤ تم کو مجھ سے محبت ہے یا نہیں۔ تاکہ میں اپنی زندگی کی قدر و قیمت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکوں"۔ اس پر میں نے یہ خیال کر کے کہ موت محبت کی طاقت کے آگے کیا ٹھہر سکتی ہے۔ دل مضبوط کر کے خوشی کے لہجے میں کہا میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ دل اور جان سے تم پر فدا ہوں۔ اور میں التجا کرتی ہوں کہ میری خاطر سے اپنی پیاری جان کی حفاظت کرو۔" اس کے بعد دل بے قابو ہو گیا اور میں زار زار رونے لگی وہ بولا "میری پیاری! میری مارجوری!" یہ کہکر اُس نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور میرے ہونٹوں اور آنکھوں کو

ہوا اور زور کے ساتھ گلے لگالیا - مَیں نے خیال کیا "اگر ہم دونو کی موت اس وقت آجائے تو کیا مبارک ہو ہم کبھی جُدا ہی نہ ہوں" ! ہم دیر تک خاموش ایک دوسرے کے گلے سے لگے رہے - آخر میرا عاشق بولا "میری پیاری تمہاری وجہ سے مَیں کل شب کو اپنی جان کی دوہری حفاظت کرونگا - اور اگر خدا کو منظور ہوا تو خیریت ہی رہیگی - افواہ یہ ہے کہ باغیوں نے جنگل میں ایک کمین گاہ بنا رکھی ہو اور ہم پر یکایک حملہ کرنا چاہتے ہیں - مجھ کو خوف بالکل نہیں - میرے ساتھ بھی بہت سے آدمی ہونگے اور اگر مقابلہ ہو گیا تو بلاشبہہ ہم فتح پائینگے - لیکن میری مارجوری تم کو معلوم بھی ہو تم نے کیا کیا ہو ؟ تم نے ایک لقمۂ اجل سے پیمانِ محبت کیا ہو - خدا جانے یہ بات تم نے اچھی کی ہو یا بُری" -

میرے دل میں یکایک اُمید اور ہمت آگئی اور مَیں نے مُسکرا کر کہا "نہیں میرے پیارے موت کا خطرہ تو ہم سبھی کو ہے - مگر موت تم کو تمہاری پیاری سے ایسی جلدی نہیں چھین سکتی - اگر خدا کو منظور ہے تو مَیں تمہاری واپسی پر بڑے فخر کے ساتھ تمہارا خیر مقدم کرونگی" - اُس نے سنجیدگی سے کہا "خدا ایسا ہی کرے - میری پیاری کیا تم مجھ سے وفا کروگی ؟ ممکن ہے کہ مَیں کئی ہفتے تک تم سے جُدا رہوں - تم اپنے عہدِ محبت پر پچھتاؤگی تو نہیں ؟ تم اپنے دِل میں میری یاد کو جگہ دوگی" ؟ مَیں نے کہا "ہمیشہ کے لئے ! مجھ پر بدگمانی مت کرو - مَیں ہمیشہ زندگی بھر اور موت کے بعد بھی تم سے محبت اور وفا کرونگی - مَیں تم سے وفا کا حلف کرتی ہوں" - وہ بولا "اور مَیں تم سے محبت اور وفا کا حلف کرتا ہوں - خدا سُن رہا ہے - مَیں اپنی رُوح کی رُو سے تمہارا شوہر ہوں اور تم میری بیوی ہو - خدا ہم دونوں کی حفاظت کرے اور اپنی مشیت پُوری کرے - میری مارجوری رخصت سے پہلے مجھ کو دُعا دو اور اپنی خوشی سے میرے ہونٹوں کو بوسہ دو" - مَیں نے اُس کو چُوما اور دُعا دی اور بڑے غم کی حالت میں اُس سے لپٹی رہی - اُس نے مجھ کو خدا کے حوالے کیا اور میرے ساتھ ساتھ زینے سے اُترا - نیچے پہنچکر اُس نے دوبارہ مجھ کو گلے سے

لگایا اور کہا "میری مارجوری کل شب کو اس وقت سے پہلے تم کو میرے ارادہ جنگ کا نتیجہ معلوم ہو جائیگا۔ اگر کامیاب ہوا تو میرا قاصد تمہارے پاس خبر لائیگا۔ اور اگر ناکامیاب رہا تو میں خود ہی تمہارے پاس آجاؤنگا۔ اور کچھ نہ پوچھو۔ میری پیاری میری جان خدا حافظ"!

اس کے بعد گویا وہ میرے پاس موجود رہنا مصلحت نہ سمجھتا تھا۔ وہ فوراً لوٹا اور تاریک راستوں میں غائب ہو گیا۔ میں جلدی سے گھبرائی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں پہنچکر اول میں نے خدا کا شکر کیا کہ اس وفا شعار اور عالی خاندان شریف کی محبت مجھ کو نصیب ہوئی۔ اور پھر اس کی جان کی سلامتی کی دعا کی۔ وہ رات بہت بے چینی میں کٹی۔ پریشان خواب اور خیالات آتے رہے۔ اور صبح کو میرا چہرہ زرد اور بھاری نظر آنے لگا۔ جب میں ناشتہ کھانے گئی تو میں نے اپنی ماں کو روتے پایا۔ میں نے خوف زدہ ہو کر اس سے رونے کا سبب پوچھا۔ وہ بولی "بچی کیا بتاؤں۔ تمہارا باپ ایسا نڈر ہے کہ ہتھیار باندھ کر پرسی کے ساتھ گیا ہے اور آج شب کو بادشاہ کو جنگل میں سے لیجائیگا میں خوب سمجھتی تھی کہ ان دونوں کا چھپ چھپ کر مشورے کرنا خالی از علت نہیں لیکن مجھ کو یہ گمان نہ تھا کہ تمہارا باپ بدیں پیرانہ سالی مجھ کو اور تم کو یوں چھوڑ جائیگا ہم سے ملکر بھی نہ جائیگا اور صرف یہ پرچہ لکھ کر چھوڑ جائیگا"۔ اور میری ماں نے روتے روتے مجھ کو ایک پرچہ دیا جس میں یہ لکھا تھا "نیک بی بی۔ مجھ کو الزام نہ دینا کہ تم سے رخصت ہوئے بغیر چلا گیا۔ کیونکہ میں ہزار مسلح باغیوں سے بھی اس قدر نہیں ڈرتا جس قدر تمہارے آنسوؤں سے ڈرتا ہوں۔ بادشاہ کی حفاظت ضروری ہے اور میں اس ضروری کام میں پرسی کا ساتھ دینے کے لئے جاتا ہوں۔ اگرچہ پرسی تو مجھ کو یہیں چھوڑ جانا چاہتا تھا۔ لڑکی کو میری طرف سے پیار کرنا۔ اور میرے سلامت واپس آنے کی دعا کرنا۔ اگر خیریت رہی تو آج آدھی رات تک ہم واپس آجائینگے۔ ہمارا فرض صرف اس قدر ہے کہ بادشاہ کو جنگل کی سرحد سے پار پہنچا دیں۔ خدا حافظ"۔ جب میں نے اپنی ماں کے آنسو دیکھے تو میرا دل اس بدفالی سے دب سا گیا۔

میں نے مقدور بھر اپنی ماں کو تسلی دینے کی کوشش کی - اس کو کیا خبر تھی کہ میرے دل میں کونسا درد تھا - اگرچہ میں دل سے اپنے باپ کی سلامتی چاہتی تھی لیکن میری بہترین دعائیں اور آرزوئیں اپنے عاشق کے لئے تھیں - میں بادشاہ سے بھی نفرت سی کرنے لگی - میں کہتی تھی کہ بادشاہ تو آخر ایک ہی آدمی ہو - اور دوسروں سے کوئی ایسا زیادہ نیک اور بہتر بھی نہیں ہو اُس کی وجہ سے اتنے بہادر شریف آدمیوں کا خون کیوں بہے - شائد یہ خیال باغیانہ ہو لیکن دُکھیا بیوائیں اور غمزدہ یتیم شہادت دے سکتے ہیں کہ مرحوم بادشاہ چارلز کی بدولت لوگوں کو خوشی کم پہنچی اور غم زیادہ -

میں نہیں کہہ سکتی کہ وُہ دن کیونکر کٹا - میری ماں بہت کم بولتی تھی اور بار بار ٹھنڈے سانس بھرتی تھی - بار بار کھڑکی میں سے جھانکتی تھی - اور خدا جانے ہم دونوں کس چیز کی راہ تکتے تھے - دن آہستہ آہستہ کٹا اور بڑی مشکلوں سے شام ہوئی - نوکروں نے کھانا میز پر چُنا - ہم نے کھانے کی کوشش کی مگر کچھ کھایا نہ گیا - جب کھانا بڑھایا گیا تو ہم پھر کھڑکی کے پاس آ بیٹھے اور پھر راہ تکنے لگے -

نہایت سنسان رات تھی - جب دالان میں گھنٹے نے گیارہ بجائے تو ہم دونوں چونک اُٹھے - میری ماں اُٹھ کر میرے پاس آئی اور اپنا ہاتھ میری گردن پر رکھا - ہاتھ ایسا ٹھنڈا تھا کہ میں اس کے چھونے سے کانپ گئی وُہ بولی "مارجوری کیا تم خیال کرتی ہو کہ وُہ خیریت سے واپس آجائینگے"؟ مجھ کو اپنی ماں پر بڑا ترس آیا - اس کی آواز کمزور تھی اور چہرے پر مُردنی سی چھا رہی تھی - میں نے بشاشت سے بولنے کی کوشش کی اور کہا - "پیاری امّاں جان - تھوڑی دیر میں ہم صحن میں گھوڑوں کے سُموں کی آہٹ سُنیں گے - اور تب یہ معلوم ہوگا کہ ہمارا خوف بیجا تھا - خُدا کے لئے اس قدر اُترا ہوا چہرہ تو نہ بناؤ نہیں تو ابا جان تمکو دیکھکر ہراساں ہو جائینگے - تم کو بشاش اور دلیرانہ صورت بنانی چاہیئے - تم ایک بہادر سپاہی کی بیوی ہو" وُہ بولی "میری مارجوری تم ایسی دلیر ہو؟ لیکن

تم کو بے خوف ہونا آسان ہے تم نے کبھی دل نہیں لگایا"۔ میں یہ سنکر کانپ اٹھی لیکن کچھ نہ بولی اس کے بعد دیر تک ہم نے نہ بات کی نہ حرکت کی۔ اتنے میں صحن میں ایک گھوڑے کی تیزی کے ساتھ داخل ہونے کی آہٹ سنائی دی اور میں اور میری ماں تڑپ کر باہر نکل گئے۔ میرا باپ نہایت بے صبری کے ساتھ زور سے پکارا "کوئی ہے! نوکروں کو ادھر بھیجو۔ ہم نے باغیوں کو مار بھگایا۔ لیکن بہادر پرسی یہاں سے ایک میل پر زخمی اور جاں بلب پڑا ہے۔ اس کو یہاں لانا ہو۔ ہیں! مارجوری! مارجوری"! میں نے دوڑ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی تھی اور خدا جانے کن الفاظ میں اس سے التجا کر رہی تھی کہ مجھ کو ساتھ لے چلو۔ وہ بولا "نہیں۔ گھوڑا پاؤں سے کچل ڈالیگا۔ لڑکی تم پاگل ہوگئی ہو۔ بی بی! مارجوری! خدا کی پناہ! یہ لڑکی دیوانی تو نہیں ہوگئی؟ میں نے چلا کر کہا "ابا جان خدا کے لئے مجھ کو ساتھ لے چلو۔ میں ساتھ چلوں گی۔ ضرور چلوں گی"۔ میری ماں روتی ہوئی اور حیرت زدہ ہو کر آئی۔ اس سے میں نے مایوسانہ سکون کے ساتھ کہا "اماں جان خدا کے لئے میری بات سنو۔ میں جارج پرسی کی منسوبہ دلہن ہوں۔ مجھ کو اس کے آخری الفاظ سے محروم نہ رکھو"۔ میرا باپ وحشت زدہ نگاہ سے مجھ کو دیکھنے لگا اور بولا "اگر خدا کے نز یہ بات سچ ہو تو میں تم کو لے جاؤنگا۔ لیکن میں ایسی عجیب داستان کا یقین کیونکر کروں" میں نے کہا "آپ خوب جانتے ہیں کہ میں نے کبھی آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بولا۔ باتوں میں وقت ضائع نہ کیجئے اور مجھے لے چلئے"۔ میں نے اپنی تمام طاقت کے ساتھ زین بمشکل پہنچنے کی کوشش کی۔ میری ماں رو کر مجھ سے لپٹ گئی۔ لیکن میں اس کی ایک نہیں سنتی تھی۔ میرے باپ نے مجھ کو اپنے آگے سوار کر لیا۔ میں خواب کے سے عالم میں تھی نوکروں کو ساتھ لیکر ہم روانہ ہوئے اور میں نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ میرے سر پر چادر تک نہ تھی۔ ایک دفعہ شاید میرے باپ نے مجھ کو پیار کیا۔ اور میرے پریشان بال درست کرنے کی کوشش کی مگر یہ بات مجھ کو ایک خواب سا معلوم ہوئی۔ مجھ کو تو ایک ہی خیال تھا

کہ میرا عاشق میرا محبوب شوہر جاں بلب پڑا ہے اور شاید ہی ہم وقت پر پہنچ سکیں۔ ہم کوڑے مارے چلے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ میرے باپ نے یکایک باگ روکی اور کہا ٹھہرو۔ گھوڑے سے اُتر کر اُس نے مجھ کو زین سے اُتارا۔ اور نوکروں کو جمع کیا۔ ایک نوکر کو گھوڑوں کی حفاظت کیلئے چھوڑا۔ اور ہم سب درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف گئے۔ درختوں کے پتوں میں سے نرم نرم چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ یہاں سبزہ زار پر بہادر پڑا تھا جب میں دوڑ کر اس کے پاس پہنچی تو چاندنی میں میں نے دیکھا کہ اُس کے بانکے کوٹ میں اُس کا خون ٹھیک اُس جگہ جم رہا تھا۔ جہاں پہلی شب کو میرا سر رکھا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے کو زرد اور خاموش دیکھ کر میرا دل غم سے ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے اُس کا منہ چوما اُس کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو دل بے حرکت تھا۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو میرا باپ اور نوکر ننگے سر کئے سر جھکائے کھڑے تھے گویا دعا کر رہے ہیں۔ میں بولی "یہ مرا نہیں۔ ابا جان یہ مر نہیں سکتا۔ آپ کوئی دوا لائے ہیں؟ آپ تو ایسے چپ چاپ کھڑے ہیں کہ گویا کوئی اُمید یا چارہ باقی ہی نہیں۔ اس کے سر کو اُٹھاؤ۔ پرسی! میرے پیارے! میری جان!" یہ کہکر میں اُس سے لپٹ گئی اور بولی "ہمت اور جوری سے بولو۔ خدا کے لئے مجھ سے بولو" اس کے بعد سناٹا ہو گیا۔ میں نے اُوپر نظر کی تو دیکھا کہ سر مہر ستارے بے دردی کے ساتھ میری جان کنی اور اُس چہرے کی طرف دیکھ رہے ہیں جو مسکراتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب مجھ کو ایسا محسوس ہوا۔ کہ گویا میرے گلے کو کسی نے گھونٹ دیا اور میرے کانوں میں سمندر کی طغیانی کا سا شور ہونے لگا۔ میری نظروں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔ تمام بدن بیجان سا ہو گیا اور میں غش کھا کر گر پڑی مجھ کو کچھ معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ جب اس کے بعد مجھ کو ہوش آیا۔ تو میں گھر پر اپنے کمرے میں تھی۔ میرے پلنگ کے پاس میری ماں بیٹھی تھی۔ اور میں بولی تو رو پڑی۔ ہوش کے ساتھ مجھ کو اپنی مصیبت اور تنہائی کا خیال بھی آیا۔ اور میں نے رو کر پوچھا اس کو کہاں دفن کیا؟ میری ماں نے کہا "ذرا خاموش رہو اور صبر کرو۔ میرا خیال کرو۔

نیکی! اپنی جان کو میری خاطر سے بچاؤ" اس کی تسکین کے لئے میں نے کہا "ہاں بیشک لیکن یہ تو بتا دو اس کو کہاں دفن کیا" میری ماں نے نرمی سے کہا "ایک ہی دن تو ہوا ہے کہ اسکو یہاں لائے تھے۔ مشرقی کمرے میں اس کی لاش تجہیز و تکفین کے لئے تیار رکھی ہے" میں خاموش ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ مشرقی کمرے میں میری منگنی ہوئی تھی۔ وہیں میری شادی ہونی چاہیئے۔ میں نے دل میں اسی وقت ٹھان لیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ لیکن اپنے ارادے کو پورا کرنے کے لئے میں نے نیند کا بہانہ کیا اور اپنی ماں سے یہ کہکر کہ میں سونی ہوں۔ بے حرکت لیٹی رہی۔ آخر خدا خدا کرکے شام ہوئی۔ غروبِ آفتاب کے بعد میری ماں میرے پاس کھانا اور شراب لائی۔ میں نے کچھ کھایا پیا اور اس سے میری ماں کو تسکین اور خوشی ہوئی۔ تب میں نے کہا "اماں جان! آپ مجھ کو تنہا چھوڑ دیں اور خود آرام کریں۔ جب میں جانوں گی کہ آپ بھی آرام میں ہیں تو مجھ کو بہتر نیند آئیگی۔ آپ رات بھر فکر اور تکلیف میں رہینگی تو مجھ کو بھی چین نہیں آئیگا۔ آپ جائیے میں خدا سے صبر کے لئے دعا مانگوں گی اور انشاءاللہ کل کو اچھی ہو جاؤنگی" میری ماں نے رو کر مجھ کو پیار کیا اور چلی گئی۔

اس کے بعد میں دعا مانگتی رہی۔ آخر گھر کے سب لوگ سو گئے۔ اور تمام گھر میں سناٹا ہوگیا۔ میں پلنگ سے اٹھی مگر میرا جسم اس قدر کمزور ہوگیا تھا کہ بڑی مشکل سے میں نے وہ سفید لباس پہنا جسکو پہنکر میں نے اپنے عاشق سے پیمانِ محبت کیا تھا۔ ایک ہیرے کی انگوٹھی جو میرا سب سے بیش قیمت زیور تھا میں نے اپنی انگلی میں پہنی۔ آہستہ سے میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور ایک مردے کے ساتھ شادی کرنے کے لئے روانہ ہوئی۔

مشرقی کمرے میں پہنچکر میں نے دائیں بائیں بالکل نہ دیکھا سیدھی اس جگہ پہنچی جہاں پارسی کی لاش رکھی تھی۔ وہ اسی لباس میں تھا جس میں وہ مرا تھا لیکن اس کے سینے پر ایک صلیب رکھی تھی اور پھولوں کا ایک ہار اس کے پاؤں میں رکھا تھا۔ اور اس کے جسم کو سیدھا

مخمل کی ایک سنہری حاشیے والی چادر سے ڈھانپا ہوا تھا - وہ بے کھٹکے پڑا تھا جسم ٹھنڈا تھا اور چہرے پر مسکراہٹ تھی - منہہ ڈھنپا ہوا نہ تھا - اور اس کی ننگی تلوار اس کے داہنے ہاتھ کے پاس رکھی تھی - میں دوزانو ہوگئی اور اس کا مردہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر میں نے زوجیت کا عہد باندھا - اتفاق سے میں نے اس کی انگلی میں ایک لعل کی ایک انگوٹھی دیکھی - میں نے تعظیم اور احتیاط کے ساتھ وہ انگوٹھی نکالی - اور اپنی ہیرے کی انگوٹھی اس کی جگہ پہنادی - اس طرح اس مردے کے ساتھ میرا نکاح تکمیل کو پہنچا - پھر میں خوب جی بھر کر روئی اور اس سرد اور خاموش چہرے کو جس کا دیدار پھر کبھی مجھ کو نصیب ہونیوالا نہ تھا - بار بار چومتی رہی - تعجب ہے کہ جس وقت میں نے اپنے پیارے کی طرف آخری نگاہ کی تو میرا کلیجہ شق ہونیکو تھا - لیکن میں یہ بھی خوب جانتی تھی کہ اس کی روح زندہ ہے اور مجھ سے روز افزوں محبت کرتی ہے اور اگرچہ یہ مشت خاک مجھ کو اس قدر پیاری ہے لیکن آخر یہ ایک خالی صندوقچہ ہے جس میں سے موتی نکال لیا گیا ہے -

میں آنسوؤں کی بھرمار سے اس قدر اندھی ہو رہی تھی کہ مجھ کو اپنے کمرے کا راستہ بھی نہ سوجھتا تھا - جب میں ہزار دقت اپنے کمرے میں پہنچی تو مجھ کو پلنگ پر چین نہ آیا - میں ہی صلیب کے سامنے دوزانو ہوگئی اور دعا کرنے لگی - صبح تک میں اسی طرح دوزانو رہی - جب صبح کو پرندے چہچہانے لگے تو میں نے مشرقی کمرے کی طرف سے پاؤں کی نرم نرم آہٹ سنی - میں سمجھ گئی کہ میرے دولہا کو دفن کرنے لیجاتے ہیں - میں نے حرکت تک نہ کی اور برابر دعا میں مشغول رہی - دیر کے بعد کوئی آہستہ آہستہ میرے کمرے کے دروازے تک آیا - دروازہ کھلا اور میری ماں داخل ہوئی - وہ مجھ کو گلے سے لگا کر بولی "ہیں! ماہ چہری! کپڑے پہن چکیں اور دعا مانگ رہی ہو؟ خیر یہ اچھا ہے" میں نے اسکو پیار کرنے دیا اور کچھ نہ بولی - تھوڑی دیر کے بعد میرا باپ آیا - وہ تھا تو ایک کھردرا سپاہی لیکن میرے لیے اس کا دل اس قدر نرم ہوگیا کہ وہ بھی رونے لگا - یہ دیکھ کر

مجھ کو عجب پریشانی ہوئی۔ وُہ لرزتی ہوئی آواز سے بولا "بچی! شریف جارج پرسی اپنے مدفن میں جا سویا۔ جو بات تم نے مجھ سے کہی تھی ضرور سچ ہوگی۔ کیونکہ میں نے اُس بہادر کی انگلی میں تیری ہیرے کی انگوٹھی دیکھی"۔ یہ سُنکر میں چونک اُٹھی کہ کہیں اُنہوں نے میری محبت کی نشانی کو اُس کے پیارے ہاتھ سے اُتار نہ لیا ہو۔ وُہ بولا "میری مارجوری! کوئی اندیشہ مت کرو کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارا باپ ایسی بے ادبی کر سکتا ہے۔ اُن محبت کی نشانیوں کو اُتارنا جو تم دونو نے آپس میں دیں ایک مقدس چیز کی بے ادبی کرنا ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے تمہارے پاس بھی اُس کی انگوٹھی موجود ہے۔ شاید میری بصارت کی پیرانہ کمزوری تھی یا کیا۔ مجھ کو تو یاد پڑتا ہو کہ وُہ اپنی لعل کی انگوٹھی اس وقت پہنے ہوئے تھا جب کل شب کو اُس کا جنازہ تیار کر کے رکھا گیا۔ نہیں میں نے غلطی کی ہوگی۔ مارجوری تمہارے ہیرے تمہارے عاشق کے ساتھ دفن ہو گئے ہیں اور بیشک وہ تمہارے کنوارپن کی محبت کے لائق تھا۔ لیکن ہمت رکھو۔ اور خدا سے دعا کرو کہ تم کو صبر عطا کرے تم کو خوشخبری دیتا ہوں کہ تمہارے دونوں بھائی جو مدت سے پردیس میں تھے اپنے دیس میں واپس آگئے ہیں اور کل تمہارے پاس آپہنچیں گے۔ جارج پرسی کی جان بھی ایک کارِ خیر میں کام آئی کیونکہ بادشاہ کم از کم اس دفعہ تو اپنے دشمنوں کے پنجے سے بچ نکلا۔ اگر پرسی اکیلا دو باغیوں کے ساتھ بہادری سے نہ لڑتا تو بادشاہ کا بُرا حال ہوتا۔ میں اس شریف کے خاندانی حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں اُس نے مجھ کو کچھ نہیں جتلایا۔ شاہ چارلز کے نام سے میری اور اُس کی دوستی شروع ہوئی۔ لیکن انجام ایسا غمناک ہوا۔ مارجوری مجھ کو کیا خبر تھی۔ تم کو اس کم سنی میں ایسی محبت اور ایسا غم پیش آئیگا۔ لیکن پیاری ہمت رکھو خدا تمہاری امداد کرے"! میرا باپ مجھ کو دعا دیکر چلا گیا۔ میں نے اپنی ماں سے کہا "اگر آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ تو جو کچھ پیش آیا ہو۔ اس کا کبھی ذکر نہ کیجئے"۔ میری ماں نے وعدہ کیا۔

اُس روز سے میری زندگی اس طرح گذری کہ مَیں دُنیا کی چیزوں سے گویا الگ تھی۔ میرے دونوں بھائیوں نے شادی کی۔ اور اب جو مَیں یہ حالات لکھ رہی ہُوں۔ اُن کے بچّے میرے اردگرد موجود ہیں اور مجھ کو پھوپھی جان کہکر پکارتے ہیں۔ میرا بڑا بھتیجا کل میرے ہاں اپنی منسوبہ دُلہن کو لایا تھا۔ وہ اٹھارہ سال کی ایک پیاری لڑکی ہے اور مجھ سے دُعا لینے آئی تھی۔ میرے محترم والدین نے بڑھاپے تک پہنچکر انتقال کیا۔ اور اب میں خدائے قادر کا شکر کرتی ہُوں کہ میرا مقدس سفر قریب الاختتام ہو۔ میں جوانی کے دن کاٹ چکی ہُوں اور رفتہ رفتہ اُس منزل راحت کے نزدیک پہنچ رہی ہُوں جس کی تمام عمر مجھ کو آرزو رہی ہے۔

میں ابھی جوان ہی تھی جو بہت سے قابل اور نیک طینت شریفوں نے مجھ سے شادی کرنی چاہی اس قسم کے تذکروں سے مجھ کو سخت رنج ہوتا تھا مگر رفتہ رفتہ اُنہوں نے مجھ کو کانٹوں میں گھسنا چھوڑ دیا۔ ایک دفعہ میرے والدین نے بھی کوشش کی کہ میں سمجھ جاؤں کہ شادی کرنے سے انکار کرنے میں میرا کس قدر نقصان ہے۔ انہوں نے بہت بہت نرمی اور ملائمت سے سمجھایا کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں۔ لیکن میں نے یہی جواب دیا کہ میری شادی تو ہو چکی ہو۔ اور اگر آپ عیسائی مذہب کے سچّے معتقد ہیں تو مجھ کو اپنے عہد پر قائم رہنے کے لئے قابل الزام نہیں ٹھہرا سکتے کیونکہ جب قیامت کے دن بچھڑی ہُوئی رُوحیں ملینگی۔ تو اپنے پیارے کو کیا مُنہ دکھاؤنگی اگر میں اپنے پیمانِ وفا کو توڑ دوں۔ جب اُنہوں نے میرا ارادہ اس قدر پکّا دیکھا تو وُہ بھی خاموش ہورہے۔ اگرچہ وُہ سخت پچھتاتے تھے کہ جب ہم نے ہرّی کو دفن کیا تو گویا اپنی بیٹی کے دل اور امید راحت کو بھی ساتھ ہی دفن کر دیا۔

لیکن زندگی کے اختصار کو دیکھ کر مجھ کو کس قدر خوشی ہوتی ہے! جُوں جُوں دن گذرتے جاتے ہیں۔ مَیں خوشی کے مارے پُھولی نہیں سماتی۔ اور میری رُوح روز بروز قوی اور جوان ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہُوں کہ اب بہت جلد میں اپنے پیارے سے جا ملونگی۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میں بے کھٹکے اُس سے آنکھیں چار کر سکتی ہُوں۔ اور کہہ سکتی ہُوں۔ کہ میری جان!

جس طرح میں نے وعدہ کیا تھا اسی طرح میں نے وفا کی!

خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی امن سے گذری۔ اور مجھ پر خدا کے بڑے بڑے احسان ہوئے

لیکن بڑی نعمت خدا نے مجھ کو یہ دی کہ مجھ کو اپنے عہد پر قائم رہنے کی طاقت عطا کی۔

دستخط مارجوری لی

اس تحریر کے آخر میں ایک اور ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ الفاظ ہیں۔

یہ مارجوری سنہ ۱۱۹۳ء میں خداوند مسیح کے یوم ولادت کو مری۔ جان نکلنے کے وقت اس کے چہرے پر اس قدر بشاشت اور امید اور امن برستا تھا کہ جو لوگ اس کے ماتم میں رونے کے لیے اس کے گرد کھڑے تھے وہ حیرت میں رونا بھی بھول گئے۔ چہرے پر مسرت اور نوجوانی کا حسن چھایا ہوا تھا۔ اور جب آخری سانس اس کے ہونٹوں سے نکلا تو وہ ایسی حسین اور پیاری دکھائی دیتی تھی جیسے کوئی سترہ برس کی دوشیزہ لڑکی ہوتی ہے۔ اسکی وصیت کے بموجب اس کو جارج پرسی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ اپنے ہاتھ میں وہ جارج پرسی کی لعل کی انگوٹھی پہنے تھی جو اس کے ساتھ دفن کی گئی +

نیرنگ

(ترجمہ)

اس پرچے کے ساتھ دو تصویریں چھپی ہیں۔ ایک تو مرحوم حضرت محسن کاکوروی کی ہے اور دوسری ہمارے مکرم مولانا سید امجد علی صاحب اشہری کی۔ محسن مرحوم کے کلام نعتیہ پر اس سے پہلے ایک مضمون چھپ چکا ہے۔ جس میں انکے کلام کے نمونے بھی درج تھے انکی تصویر کا چھپ جانا ضرور ایک تبرک کی چیز ہے۔ جسے اس عاشق رسول مقبول کے مداح عزیز سمجھکر ضرور اپنے پاس رکھینگے۔ مگر مولانا اشہری کی تصویر ملنے کو بھی ہم غنیمت سمجھتے ہیں۔ گو خدا کے فضل سے وہ ابتک ہم میں موجود ہیں۔ اور ہم دعا کرتے ہیں کہ وہ تادیر سلامت رہیں۔ مولانا اشہری ان چند بزرگوں میں ہیں جنہوں نے اپنی عمر علم و ادب کی خدمت میں صرف کر دی ہے اور جنکی ذات میں پرانے زمانہ کی تربیت اور نئے زمانے کی روشن خیالی دونوں جمع ہیں۔ نظم میں انکی استادانہ مہارت انکے کلام کی صفائی و پختگی محتاج تعریف نہیں +

منازلِ حیات

میرزا محمد حسین صاحب بی۔ اے نے ذیل کے منتخبات منازل السائرہ سے انتخاب کر کے مخزن میں اشاعت کے لئے بھیجے ہیں۔ یہ انتخابات بجائے خود نہایت دلچسپ اور قابل قدر ہیں۔ اور گو کتاب منازل السائرہ شائع ہو چکی ہے۔ ہم ان مضامین کو نیت سے ناظرین بالکل نیا پائینگے۔ اور جو پہلے دیکھ چکے ہیں۔ انکو تو مکرر کا مزہ آئیگا۔ مولوی عبد الراشد صاحب کی تحریر کو دوبارہ سہ بارہ پڑھنے سے طبیعت سیر نہیں ہو سکتی۔

گلزارِ شیر خوارگی

یہ ایک چھوٹا سا مگر خوشنما و شاداب باغیچہ تھا مختلف عمروں کے آدمی مرد اور عورتیں بادِ بہاری کا لطف اُٹھاتے پھر رہے تھے۔ صبحِ سعادت کا وقت تھا گلہائے رنگین کی پیاری صورتوں نے زمینِ چمن کو بوٹموں کر رکھا تھا۔ شبنم نے موتیوں کے ہار بچھا دیئے تھے۔ بادِ صبا فرحت و انبساط کے مژدے دیتی پھر رہی تھی۔ عورتوں کی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ مرد جوق جوق ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ہنستے بولتے ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ اُمید نے اُنکے چہرے لال لال اور دل چونچال کر رکھے تھے۔ ہرے بھرے گلزار آنکھوں کے سامنے لہلہا رہے تھے۔ ارمانوں کے تند تیز چشمے کشتِ اُمید کو تر و تازہ کر رہے تھے۔ انتہائے نظر اور حدِ خیال تک چپہ چپہ سرسبز سرسبز شاداب دکھائی دیتا تھا۔ وسطِ چمن میں ایک دودھ کی نہر لہریں لے رہی تھی۔ گیا بیفکری کا زمانہ تھا۔ مسافروں ہی چھوٹے چھوٹے بچے جوک کی کنارے پر آئے منہ لگایا اور اسیر ہو گئے۔ ہائے کیا نعمت تھی کہ پیچھے سے لگا کر زمین بھر کی کلفت دور ہو جاتی تھی۔ افکار و ملال خواب و خیال ہو رہے تھے۔ رنج و غم عنقا ہو

تھا۔ کیا دولت تھی جس کے مقابل ہفت اقلیم کی سلطنت ہیچ و بے وقعت تھی۔ بادشاہِ وقت کا حکم اتنا مناسب تھا کہ ہر شخص مسافر نوازی اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اس خدمت سے محروم رہ جاتا تو اپنے تئیں نہایت بدقسمت تصور کرتا۔ کیا مبارک سرزمین تھی جو مرد نظر آیا شگفتہ اور جو عورت دکھائی دی وہ باغ باغ۔ عورتوں کے پرے کے پرے جس وقت مسافروں کو گود میں لیکر گلگشت کو نکلتے تھے۔ درختوں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔

یہ محافظ و خبرگیر جو مسافروں کی خدمت پر متعین ہے کیسے اچھے لوگ تھے کہ سو طرح سے نثار تھے ذرا مسافر کے پھانس لگی اور بےچین ہوئے۔ ان لوگوں کی پیشانیاں ستارۂ صبح کی طرح روشن تھیں اور ان کے دل برکتِ نور سے معمور۔ محبت کا سرمہ ان کی آنکھوں میں لگا ہوا تھا اور خدمتگزاری کی روشنی ان کے چہروں پر چمک رہی تھی۔ مکر کا نام نہ تھا ریا کا کام نہ تھا خالص محبت تھی اور سچی خدمت۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے کہ جان تک دریغ نہ کرتے تھے۔ خوش قسمت میزبان تھے کہ کامیابی کے ساتھ مہمانوں کی خدمت ختم کرتے تھے اگر کوئی مسافر ان کی خدمت ہی میں ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو جاتا تھا تو روتے تھے اور پیٹتے تھے۔ یہاں ایک بات دیکھ کر بہت ہی تعجب ہوا۔ بہت کم مسافر ایسے نظر آئے کہ خدمتِ محافظین کو مدنظر رکھا۔ اس خدمت کا معاوضہ تو خیر ناممکن تھا۔ جب وہ وقت آتا کہ وہ ان کے محتاج ہوتے تو یہ آنکھ چرا جاتے۔ لذتِ نفسانی کے پابند ہو جاتے غیروں سے محبت کرتے دوستوں سے اختلاط کرتے خود محافظ ہو کر مسافروں کی خدمت کرتے لیکن وہ خدمت فراموش کر دیتے جس کی بدولت خدا نے اس قابل کیا۔ پھر بھی وہ اللہ کے بندے ہر حال میں خوش تھے۔ جسکو سنا یہی کہتے سنا "خدمت کرو تمہاری سعادت ہے ذکر و کچھ شکایت نہیں"۔

منزلوں مسافروں کے ہمراہ جاتے اور حتی المقدور آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ ہر منزل میں خدمت کرتے اور مصیبت میں شریک رہتے۔ ان میں بعض ناعاقبت اندیش ایسے بھی تھے جو عقل کی آنکھوں پر پردے ڈال لیتے تھے اور درجۂ محبت کو کمال پر پہنچا کر خاک

کا امتیاز کھو دیتے تھے۔ اپنے بُرے اعمال یا ناقص افعال کا نمونہ دکھا کر مطلبِ اصلی خبط کر دیتے تھے اور پہلی ہی منزل سے مُسافر بیچاروں کی باٹ ماری شروع کر دیتے تھے۔

(۲)

سرائے طفولیت

سرائے طفولیت ایک عالیشان محل حیات آباد میں آسمان سے کھڑا باتیں کر رہا تھا شہر کے ہر چہار طرف چونہ گچی کی پُختہ عمارتیں بنی ہُوئی تھیں۔ سرا کے دروازہ خاص پر رنگ برنگ کے جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ دیواروں کی گلکاریاں محرابوں کے نقش و نگار موسم بہار کا مزہ دے رہے تھے۔ رنگا رنگ کے جواہرات جڑے ہُوئے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ لوگ خوشحال و فارغ البال۔ نہ کوئی مفلس نہ کنگال۔ بازار کشادہ و بارونق۔ دوکاندار خلیق و منکسر مزاج۔ عجیب مقام تھا کہ ہر طرف بیفکری کے ڈنکے بج رہے تھے۔

سرائے کے اندر ہر طرف وسیع و پُختہ کمرے بنے ہُوئے تھے بیفکری کا دَور تھا۔ اطمینان و فارغ البالی کی حکومت تھی۔ امیری کا رخانہ تھا بادشاہت کا زمانہ تھا۔ محافظ زیادہ وُہی تھے جو منزلِ اوّل میں تھے۔ مگر محبت کا نمبر پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ مسافروں کی قدر و منزلت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ کیا مُبارک سرزمین تھی کہ رنج و غم پاس آکر نہ پھٹکتا تھا! ناعاقبت اندیشی انواع و اقسام کی نعمتیں اُنکے دسترخوان پر چُن دیتی تھی۔ کھیل کود کی خلعت گراں بہا زیبِ تن خوشی کا تاج سر پر لگائے ہُوئے اِدھر اُدھر پھرتے تھے کیا دن تھے کہ پھر نہ آئے اور کیا جگہ تھی کہ دوبارہ دیکھنی نصیب نہ ہُوئی۔ بُغض و حسد کا گذر نہ تھا فکرِ معیشت کا پتہ نہ تھا۔ دولت و عُسرت کا امتیاز نہ تھا۔ نخوت و غیبت کا نام نہ تھا۔ جو عزت ہُوئی وہ برنج۔ جو خوشی ہُوئی وہ پُوری۔ اُن کی بھولی بھولی باتوں اور سیدھے سادے معاملوں پر آسمانِ انصاف سے موتی برس رہے تھے۔ فراغت و

اطمینان کا باغبان خوشی و خرمی کے پھول نچھاور کر رہا تھا۔ محبت و پیار کے ہار گلے میں پڑے تھے کامیابی کے گلدستے طاقوں میں چُنے ہُوئے تھے۔ آرام و آسائش کی بیلیں دیواروں پر چڑھی ہُوئی تھیں۔ غرض ہر قطعہ گلزار ارم بنا ہوا تھا۔
محافظ و خبر گیر کیسے کیسے خدمتگذار کہ حکم کی دیر اور تعمیل کو تیار۔ ایسے ایسے نازبردار کہ ذرا سے اشارے پر جان نثار کرنے کو آمادہ انتظام اتنا معقول کہ بڑے بڑے سرکش و تاجدار مسافروں کے سامنے عاجز و لاچار تھے۔ اِس منزل کا تمام زمانہ آزادانہ و بیباکانہ گذر گیا۔ ضرورت سے پہلے اور حاجت سے پیشتر ہر چیز تیار اور موجود۔ نہ کسی بات کا کھٹکا تھا نہ کسی قسم کا خوف۔ نہ عزت کی خواہش تھی نہ دولت کا ارمان۔ نہ نخوت کے اسباب نہ غرور کا سامان۔ جو ملا وہ کھا لیا۔ جہاں نیند آئی وہاں پڑ رہے۔ طبیعت میں شر نہ تھا۔ اور دل میں فساد نہ تھا۔ "کیا ہوگا" کا فکر نہ تھا۔ "کیا ہو گیا" یہ یاد نہ تھا۔ کوئی بات خلافِ مزاج ہوئی رو دیتے کوئی چیز اچھی ہاتھ آ گئی ہنس دیئے۔ مگر طبیعتوں میں قبولیت کا مادہ موجود تھا جو سُنتے تھے وُہ کہتے تھے جو دیکھتے تھے وُہ کرتے تھے۔ نتائج سفر کا دارومدار اسی جگہ تھا۔ ذرا سی لاپروائی بد تر سے بد تر بنا دیتی تھی +

(۳)

چمنستانِ شباب

چمنستانِ شباب کی سرحد میں داخل ہوتے ہی طبیعت خود بخود شگفتہ ہونے لگی۔ ہوا کے فرحت بخش جھونکے دل و دماغ کو تر و تازہ کرنے لگے۔ پھولوں کی تیز اور مست خوشبو سے کوسوں تک جنگل مہک رہا تھا۔ جُوں جُوں آگے بڑھتے گئے دل میں اُمنگ اور خواہشیں پیدا ہوتی گئیں۔ پاس پہنچکر دیکھا ایک خوشنما باغ دُور تک چلا گیا ہے۔ دروازے لگے ہُوئے ہیں۔ چار دیواری کھنچی ہوئی ہے مگر اندر جانے کے واسطے اجازت عام ہے۔ کسی قسم کی روک ٹوک

نہیں۔ آگے قدم بڑھایا۔ تمام عالم سرسبز و شاداب نظر آیا۔ ہر قطعہ چمن بہشت بریں بنا ہوا ہے رنگ برنگ کے پھول کھل رہے ہیں۔ خوشبوؤں نے ہوا اور ہوا نے باغ کو مہکا رکھا ہے۔ گلاب کے تختے پھیلے ہوئے ہیں۔ میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے چشمے بہ رہے ہیں۔ بارآور درخت گھنے کے گھنے جھوم جھوم کر زمین کو چوم رہے ہیں۔ طائرانِ خوش الحان ڈالیوں پر میٹھے چہکار رہے ہیں۔ ہرے بھرے درخت کھڑے لہلہا رہے ہیں۔ پرند کلیلیں کر رہے ہیں۔ گملے قطار در قطار چنے گئے ہیں۔ کیلے کی چھاؤں دُور تک پھیلی ہوئی ہے سنگ مرمر کے حوض بنے ہوئے ہیں۔ رنگ برنگ کی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ وسط چمن میں ایک بارہ دری ہے۔ پٹاپٹی کے پردے پڑے ہوئے ہیں مخمل رُومی و کاشانی کا فرش بچھا ہوا ہے۔ کنیزان مہرو سر سے پاؤں تک جواہرات میں ڈوبی زرق برق لباس سے آراستہ پیراستہ ادھر اُدھر پھر رہی ہیں۔

سرائے طفولیت کی طرف سے مسافر بھاگے دوڑے چلے آرہے تھے اور چمنستان شباب کے اسباب دیکھ کر اس طرح دلدادہ ہوتے تھے کہ گویا اب تمام عمر یہ فرحت و شگفتگی ان کا ساتھ نہ چھوڑیگی۔ اس سرزمین کی ہر چیز میں کچھ ایسا مقناطیسی اثر تھا کہ دل خود بخود کھنچا چلا جاتا تھا۔ دو چار صورتیں ایسی بھی دکھائی دیں جنہوں نے اس بات کا پتہ لگا لیا کہ یہ دلفریب جلوے عارضی و فانی ہیں۔

غور سے دیکھا تو درحقیقت تمام چمنستان ایک جادو کا کارخانہ تھا۔ گلاب کے پودے کانٹوں سے پٹے پڑے تھے۔ چنبیلی کے جھولوں میں شہد کی مکھیاں چھپی بیٹھی تھیں بیلوں میں سانپ بچھو لپٹے ہوئے تھے۔ چشموں کا پانی دیکھنے میں صاف شفاف مگر پینے میں زہر ہلاہل۔ چور، قزاق گرہ کٹ اُٹھائی گیرے آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے اور اپنے فن کے ایسے کامل و ہوشیار کہ کیسا ہی تجربہ کار آدمی کیوں نہ ہو بات کی اور گرفتار ہوا۔ نشے کا سا عالم تھا۔ جو نظر آیا وہ بیخود اور سرشار۔ دیواروں پر خوبصورت

تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ مگر ہر تصویر ایک دام تزویر تھا ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھا اور گلے کا ہار ہوئی۔ جو چیز تھی دیکھنے میں کچھ برتنے میں کچھ۔ ہوا کے خوشگوار جھونکوں تک میں سمیت ملی ہوئی تھی ذرا ہوا لگی اور مسافر کچھ کا کچھ ہوا۔ باغ کے اُس طرف ایک بیابان تھا۔ ڈھاک کا جنگل کوسوں دور چلا گیا تھا۔ جانوران صحرائی ہر طرف بسے ہوئے تھے۔ درندوں کی خوفناک آوازسے رات کو تمام جنگل گونج جاتا تھا۔ بھیڑیے بسا اوقات اندر گھس آتے تھے۔ شیروں کے مُنھ کو خون لگا ہوا تھا۔ چیتے ہر وقت تاک لگائے رہتے تھے۔ ہاتھیوں کا غول بارہا ادھر سے اُدھر نکل جاتا تھا۔

چمنستان شباب کے پانی میں خاص طور پر یہ تاثیر تھی کہ مسافر اپنی اصلیت بھول جاتا تھا۔ حرص وتمنا دامنگیر ہو جاتے تھے خواہش وارمان کا ہجوم ہو جاتا تھا مزاج میں نخوت آجاتی تھی۔ آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑجاتے تھے حُسن وعشق کی تصویریں دلوں کو مسخر کرلیتی تھیں۔ اتلاف حقوق ظلم وتعدی عادات ہو جاتے تھے۔ خوف خدا غارت ہو جاتا تھا۔ خودغرضی کا جال ایک طرف بچھا ہوا تھا۔ علائق کی زنجیریں دوسری طرف پڑی ہوئی تھیں۔ غرض از ابتدا تا انتہا چمنستان اور بارہ دری ایک سانچا تھا کہ مسافر کو ڈھال اور دوسری طرف پھینکدیا۔ گرفتارانِ بلا ہاتھوں میں ہتکڑیاں پاؤں میں بیڑیاں جکڑے ہوئے اور کسے ہوئے دھکے کھا کھا کر باہر نکلتے تھے۔ زمانہ گذشتہ کی یادگار دو چار کلنگ کے ٹیکے دس پانچ بدنامیوں کے تمغے باقی رہ جاتے تھے۔ گناہوں کی بھاری گٹھڑی سر پر ہوتی تھی۔ مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے۔ مگر جو قدم اُٹھتا تھا پھر پلٹ نہیں سکتا تھا۔

یہ لوگ اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلہاڑیاں مارتے تھے۔ ورنہ خود چمنستان شباب کے واقعات اگر چشم بصیرت سے دیکھتے اور تامل صحیح کرتے تو اصلاح کو کافی تھے۔ بیمار پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ مصیبت زدہ چیخ چلا رہے تھے۔ قبرستان قریب ہے اور مرگھٹ کھوپریوں اور ہڈیوں سے پٹ رہے تھے۔ کوئی ماں کے غم میں سوگوار تھا۔

کوئی باپ کے رنج میں بیقرار۔ کسی کی بہن چھٹ رہی تھی۔ کسی کا بھائی جدا ہو رہا تھا۔ ایک جوان بیٹی کو رو رہا تھا۔ دوسرا بیٹے پر جان کھو رہا تھا۔ کوئی رو رہا تھا کوئی ہنس رہا تھا کہیں پیدائش کہیں موت کہیں چھٹی کہیں برات کہیں دن کہیں رات۔ زمین سے لیکر آسمان تک ہر چیز رنج و فکر میں ڈوبی ہوئی مرد مغموم عورتیں متفکر۔ غرض جو تھا بڈھا ہو یا جوان حیران و پریشان۔ عظیم الشان محل ویران پڑے تھے۔ سنگین و پختہ عمارتیں سنسان کھڑی تھیں آبادی بیشمار تھی مگر ہر ایک اپنے دکھ درد میں گرفتار تھا۔ بہت سے ایسے بھی تھے جنکو خدا نے ہر اعتبار سے مالا مال کر رکھا تھا عنایت ایزدی شامل حال تھی صاحب اولاد تھے فارغ البال تھے مگر غور سے دیکھا تو رنج و آفات میں بال بال جکڑے ہوئے تھے۔ مساہلت و غفلت کی انگلیاں اُن کے کانوں میں ٹھسی ہوئی تھیں اور طمع و حرص کے پردے آنکھوں پر پڑے ہوئے تھے +

(۴)

عالمِ ضعیفی یا دریائے انحطاط

چمنستانِ شباب کے اُس کنارے پر حیات آباد سے ملا ہوا دریائے انحطاط لہریں لے رہا تھا لوگ کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر پار اُترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ موجوں کے تھپیڑے پانی کے گرداب پہاڑوں کی چٹانیں بادِ مخالف کے جھونکے دھارے کے سامنے بھی مشکل سے آنے دیتے تھے۔ غفلت والا پروائی کے ناخدا جب کسی بلا کا سامنا ہوتا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے۔ مسافروں کی آنکھوں پر ایسے غفلت کے پردے پڑے ہوئے تھے کہ ساتھ کی کشتیاں برابر ڈوبتی چلی جاتی تھیں اور اپنی بربادی کا خیال بھولکر نہ آتا تھا۔ حیاتِ ابدی کا تکیہ لگائے ہوئے ہوس و ارمان کے میٹھے ترانے سنتے چلے جاتے تھے۔ اہتمامِ سفر کا کوئی وقت معین نہ تھا۔ زندگی کے تمام سامان کشتیوں میں موجود تھے

اور دُنیا بھر کے کاروبار پانی میں ہو رہے تھے۔ عاقبت اندیشی کا گذر نہ تھا انجام پر نظر نہ تھی غرور کا سودا دماغوں میں سمایا ہوا تھا طمعِ زبردست شفقت پھیر رہی تھی۔ ذرائع ناجائز گود میں لوٹ رہے تھے۔ بے ایمانی کی گھٹا سروں پر چھائی ہوئی تھی۔ نام و نمود کے کہرے نے کوسوں تک تیرہ و تار کر رکھا تھا۔ ناپائداری دُنیا کا ابر تلا ہوا سروں پر کھڑا تھا مگر ہٹ دھرمی اور خود پسندی کی خوبصورت دیبیاں آنکھ اُٹھانے کی مہلت نہ دیتی تھیں۔ ریاکاری کا تلاطم برپا تھا۔ مکرو فریب کے گھڑیال مُنہہ کھولے بیٹھے تھے۔ اتلافِ حقوق کے بھنور جابجا پڑ رہے تھے مگر یہ اُمید کے بندے ہمچو من دیگرے نیست کے نعرے مار رہے تھے۔

گناہ اور قصور کے اُونچے اُونچے پہاڑ پرا جمائے کھڑے تھے قُطب نُما اور دُوربینیں خاک کام نہ کرتی تھیں۔ باپ کی ناؤ ٹکر کھا کر بیچ منجدھار میں ڈوبتی تھی۔ ساتھ کی کشتیوں کو ڈوبتا دیکھ کر بھی باقی ماندہ ہمسفر احتیاط نہ کرتے تھے اور ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ جو ڈوبا وہ اسی نتیجے کا سزاوار تھا۔ مجھ کو کوئی کھٹکا نہیں۔ دُوسری کشتیوں کی تباہی دیکھ کر ہنستے تھے اور جب اپنے اُوپر آ کر پڑتی تھی تو چیختے جاتے تھے اور ڈوبتے جاتے تھے۔

دریائے انحطاط میں ایک جزیرہ نظر آیا "جزیرہ ندامت"۔ چند نیک سیرت بزرگ صُورت پھُوس کی جھونپڑیاں ڈالے ہُوئے سرنگوں بیٹھے تھے۔ اُن کی سپید داڑھیاں اُن کے چہروں پر نور برسا رہی تھیں۔ فضیلت کے بڑے بڑے عمامے سر سے بندھے ہُوئے تھے مگر فتنہ پردازی کی چھینٹیں پڑی ہُوئی تھیں اور گھٹے پڑی ہوئی پیشانیوں پر کلنک کا ٹیکا چمک رہا تھا۔ افعالِ گذشتہ کا تاسف اور اعمال کی پشیمانی چاروں طرف سے گھیرے ہُوئے تھی ازفرق تا پا عرقِ خجالت میں ڈوبے ہُوئے تھے۔ آسمان پر نگاہ تھی اور لب پر اللہ ہی اللہ تھا۔

ایک گروہ دیکھا قویٰ بالکل بیکار ہو گئے تھے مُنہہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ سر پر موت منڈلا رہی تھی مگر حسرت و ارمان دونوں طرف مورچھل ہلا رہے تھے۔ انقلاب زمانہ نے انکی

صورتیں بگاڑ دی تھیں۔ دُنیا ان سے بھاگ رہی تھی اور وہ دُنیا کو لپٹ رہے تھے۔

ایک جم غفیر عورتوں کا ایسا ملا کہ اس کبرسنی میں بھی جبکہ قبروں میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں ہی نمائش ظاہری سے فرصت نہ تھی۔ بُغض و حسد کا کاجل آنکھوں میں پھیلا ہوا تھا۔ نخوت و غیبت کے تیل سے سر گندھے ہُوئے کذب و افترا کا زیور پہنے ہُوئے نافرمانی کا جھُومر لگا ہوا شرک و بدعت کے پھُول بھرے ہُوئے مکر و فریب کا تکیہ لگائے ہُوئے حیاتِ ابدی کا پٹہ لکھائے ہُوئے تن تن کر اپنے حُسن صُورت کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک شخص کو دیکھا آنکھوں سے اندھا ہاتھوں سے لُولا پاؤں سے لنگڑا مُنھ میں دانت نہیں پیٹ میں آنت نہیں۔ ڈاڑھی سفید بگلے کا پر پکیں سوئی کا ناکا ایک درخت کے نیچے کھڑا بیاج کے ٹوٹنے کو رو رہا تھا۔

اس سے ملی ہوئی سرحد عدم آباد تھی جس کی پختہ و سنگین فصیل آسمان سے باتیں کر رہی تھی بلندی کا یہ حال تھا کہ پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا وسعت و رفعت کی یہ کیفیت تھی کہ اندر کی آواز باہر نہ آتی تھی۔ مُسافروں کو لوگ پھاٹک تک پہنچا سکتے تھے "آگے کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکتا تھا: دروازے پر ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا "مُبارک ہیں وہ لوگ جو اپنا سفر نیکنامی کے ساتھ پُورا کر کے آئے"۔

محمد عبد الراشد دہلوی

اگر کسی وقت طبیعت اُداس ہو اور پریشان کرنے والے خیالات طبیعت پر غالب ہوں تو اپنی کتابوں ہی کی طرف توجہ کرو۔ یہی تمہارا دل بھی بہلائینگی اور یہی ہر قسم کے متوحش خیالات تمہارے دل و دماغ سے دُور کر دینگی۔ اور جس وقت بھی تم اُن کی طرف رجُوع لاؤگے تمہارے ساتھ نہایت اخلاق سے پیش آئینگی اور ہر وقت تمہاری اُداسی اور پریشانی کو دُور کرنیکے لئے دست بستہ حاضر ہونگی۔

عالمِ ارواح کی سیر

رُوح کیا چیز ہے۔ اور مرنے کے بعد کہاں چلی جاتی ہو۔ ایک مشکل سوال ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ رُوح اثر وار کیفیت کا نام ہے۔ جسم میں اُس کی تاثیریں محدود رہتی ہیں اور جسم سے جُدا ہو کر اس کے اثر کی وسعت لامحدود ہو جاتی ہے۔

شاید یہ بیان سچ ہو کیونکہ ہم مرنے والوں کے مقبروں اور رہنے کے مکانوں میں ایک ایسی کیفیت محسوس کرتے ہیں جس میں صاحبِ قبر اور صاحبِ مکان کی گذشتہ حالت کا اثر صاف طور سے نظر آتا ہے۔ اور اوقات کی تبدیلی سے مختلف شکلوں میں جلوہ دکھاتا ہو۔ چنانچہ جنوری سنہ ۱۹۰۶ء کے اخیر عشرہ میں آگرہ کی مشہور عمارتیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تو ہر عمارت میں رُوحانیت کا موثر ظہور دیکھا جاتا تھا۔ انہی کیفیات میں سے بعض کو مخزن کے لئے قلمبند کر لیا گیا تاکہ نوعِ انسان کے اور افراد بھی وجودِ مطلق کے کرشموں کا مشاہدہ کریں۔

سب سے پہلے جلال الدین محمد اکبر شاہ کے مقبرہ کی زیارت کی۔ جو فنِ تعمیر کا نہایت اعلیٰ اور خوشنما نمونہ ہے۔ مرقد کے بالائی حصّہ میں قبر کے تعویذ پر آسمان کا سایہ ہو۔ سُورج کی روشنی میں اکبری جاہ و جلال کی رُوح رعب و سکوت کے ساتھ قائم نظر آتی ہے۔ لیکن جب نیچے کے طبقہ میں جائیں جہاں اصلی مدفن ہو تو تاریکی و وحشت کا سامنا ہوتا ہو۔ قبر کی سبز چادر بھی دیر تک دکھائی نہیں دیتی۔ خیال کی آنکھیں بوڑھے شہنشاہ کو کفن کی کوٹھڑی میں لپٹا ہوا دیکھتی ہیں۔ دروازہ پر بیکسی و لاچاری کا پہرہ اور اندر عبرت کی رُوح پر پھیلائے نظر آتی ہے۔ اس وقت اگر تم اکبر کی اس رُوح کا خیال کرو جو جسم میں قید تھی اور شہنشاہی کے مزے لوٹتی تھی تو وہ بھی فوراً آ جائیگی اور اس اندھیری کوٹھڑی میں اپنا گذشتہ تماشا دکھاوے گی۔ مگر میں تو جانا چاہتا ہوں۔ تاکہ نواب اعتماد الدولہ کے

مقبرہ کو دیکھوں۔ یہ مقبرہ شہر کی آبادی کے قریب جمنا کے پار واقع ہے۔ چھوٹی سی عمارت ہے مگر اس قدر حسین و خوشنما ہے کہ آنکھیں سیر نہیں ہوتیں۔ اس میں وہ باپ سوتا ہے جسکی بیٹی لاہور میں دریا کے کنارے خاک میں مل پڑی ہے اور دردمند آنکھوں کو رُلاتی ہے۔

مرزا غیاث کے مقبرہ میں بیٹھ کر جمنا کے چمکدار پانی کی سیر کر رہا تھا اور دلگیر شاہ صاحب (جو آگرہ کے مشہور بزرگ خاندان سے ہیں) پہلو میں تھے۔ کہ اتنے میں نامراد نورجہاں کی رُوح شکستہ کشتی میں سامنے سے گذری۔ جس نورجہاں کے سبب مرزا غیاث اعتماد الدولہ بنے اور ایسی خوبصورت خوابگاہ پائی وہی بدنصیب ویران مسہری سے گھبرا کر یوں ماری ماری پھرتی ہے۔

بے وقوف راویوں نے بیان کیا کہ اعتماد الدولہ تاج محل کا میر عمارت تھا جو پتھر تاج سے بچا وہ اپنے مقبرہ میں لگا لیا۔ مگر اس روایت پر وہی بے خبر یقین کرتے ہیں۔ جنہیں معلوم نہیں ہے کہ اعتماد الدولہ شاہجہان کی تخت نشینی سے پہلے مر گیا تھا۔

آگرہ کے قلعہ میں دہلی کے قلعہ کی نسبت زیادہ عمارتیں باقی ہیں۔ موتی مسجد سر سے پیر تک سنگِ مرمر کی ہے اور اس قدر خوشنما ہے کہ دہلی کی جامع مسجد بھی ایک دفعہ دل سے فراموش ہو جاتی ہے۔ ایک تصویر ہے جس کو نور کے سانچے میں ڈھال کر کھڑا کر دیا ہے۔

دیوان عام و خاص زیادہ اچھے نہیں البتہ بیگمات کے محل عمدہ و خوشنما ہیں۔ جودہ بائی کا محل بالکل ہندوانی طرز کا بنا ہوا ہے۔ جودہ بائی کی نسبت گائڈ بیان کرتے ہیں کہ اکبر کی بیوی تھی۔ حالانکہ جہانگیر کی بیوی اور شاہجہان کی ماں ہونے کا ثبوت موجود ہے۔ گائڈ لوگ بہت سی جھوٹی باتیں بنا لیتے ہیں۔ جس کے باعث غیر ملک کے سیاحوں کو دھوکہ ہوتا ہے اور وہ ایشیائی بادشاہوں کی نسبت غلط خیال قائم کر لیتے ہیں۔ چنانچہ مجھ کو ایک چھوٹا سا حجرہ دکھایا گیا۔ جس کے اندر دو آدمی مشکل سے سو سکتے ہونگے۔ اور کہا کہ یہاں شاہجہان قید تھے۔ اور اس سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ تمام قلعہ میں

جل پھر سکتے تھے - اور محض نظر بندی کی قید تھی - دیوان خاص کی پیشانی پر جو تحریریں ہیں اُن میں ایک عجیب بات دیکھی گئی کہ ایک رُخ پر تو عمرؓ و علیؓ لکھا ہے اور دوسرے رُخ پر عثمانؓ و ابوبکرؓ یہ ترتیب باوجودِ غور سمجھ میں نہیں آئی -

شام کے قریب اُس عمارت میں پہنچے جو تمام ایشیا کا فخر ہے - جس کی صنّاعیوں نے آجکل کے یورپ کو بھی حیرت میں ڈال رکھا ہے - جو دُنیا کی لاثانی عمارتوں کا تاج ہے -

جس وقت ہم نے دروازہ میں قدم رکھا اور سامنے نظر اُٹھائی تو نُورانی گنبد پر دھوپ کی زرد شعاعیں چمکتی دکھائی دیں - اور آگے بڑھے تو باغ کی سبز ٹہنیاں خوشرنگ پھولوں سے جھوم رہی تھیں - شاہ دلگیر تو ان نظاروں میں محو ہو کر باہر بیٹھ گئے اور میں تاج محل میں رہنے والی ارجمند بانو کے پاس اندر پہنچا - نصیبہ والی ملکہ جڑاؤ چھپر کھٹ میں قرآنی حرفوں کا دوشالہ اوڑھے لیٹی تھی - پہلو میں شاہجہان تھا اور خاکی چمن کے پردہ میں راز نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں

نُورانی مکان میں ظلمت کی باریک چادر بچھی ہُوئی تھی اور میں شاہجہان و تاج بی بی کے عالمِ ارواح کی سیر کر رہا تھا کہ ایک گرجدار چیخ کی آواز آئی اور میں اپنے استغراق سے چونک پڑا - دیکھا کہ قبروں کے سامنے دو انگریز کھڑے ہیں اور ان کے سُنانے کو خادمِ مقبرہ نے نعرہ لگایا ہے (بلند گنبد چاروں طرف سے بند ہے اس لئے گونجتا ہے - آواز ٹکراتی ہوئی نیچے واپس آتی ہے تو عجیب غریب سُر معلوم ہوتے ہیں - خادم لوگ تماشا دکھانے کے خیال سے چیخا کرتے ہیں) آواز نصف منٹ تک بُرج میں چکر لگاتی رہی اور آسمانی باجوں کے سُروں کا مزا آ گیا - لیکن ساتھ ہی ملکہ کی ناتوان آواز گوشِ خیال میں آئی جس کے یہ لفظ سمجھ میں آسکے

گستاخ - بے ادب - چُپ - چُپ ...... ارے میری نیند - نیند - سر میں درد - در ...

اس ایک موتی کے محل سے نکل کر باہر آیا تو خدائی کا جلوہ نظر آتا تھا - اور بیسیوں یورپین نقشِ حیرت بنے کھڑے تھے - سامنے جمنا تھی - جو سردی کے سبب سُکڑی ہُوئی ریت کا لحاف اوڑھے تاج کی ملکوتی شان کو دیکھ رہی تھی - غرضکہ ہر در و دیوار پر رُوحانی حُوریں ناچ

سنگار کیے بیٹھی تھیں۔ اور ملکۂ ارجمند بانو تاج محل کے نام پر درود پڑھ رہی تھیں۔ اِن سب کی زیارتیں کرتا ہوا شاہ دلگیر کے پاس پہنچا اور ان کے ہمراہ باغ کی سیر کرنے لگا۔ ایک ہندو نوزادہ نوعمر مالی رہبر بنا۔ ہر درخت کو نام بنام بتاتا جاتا تھا۔ ایک درخت کو کہا کہ یہ آشو ہے۔ پوچھا گیا۔ آشو کیا۔ نظریں جھکا کر جواب دیا۔ وہی جسے مسلمان شمشاد کہتے ہیں۔ اِس بیساختہ جواب سے بڑا لطف آیا۔ اور تاج پر حسرت کی آخری نگاہ ڈال کر رخصت ہو گئے۔ جی چاہتا تھا کہ صبح کا تاج۔ چاندنی کا تاج۔ تاریکی کا تاج۔ برسات کا تاج۔ وقت ملے تو سب دیکھیں مگر افسوس یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

اتفاق سے مولوی معین الدین جنرل اسپرنٹنڈنٹ کلکٹری متھرا کی کتاب معین الآثار مل گئی جن میں تاج محل کے محققانہ مفصل حالات تھے اس کے پڑھنے سے اور بھی مسرت ہوئی اور خوش و خرم مکان کو واپس ہوئے راستہ میں شاہ دلگیر نے یہاں نظیر اکبر آبادی کی قبر دکھائی جو بالکل شکستگی کی حالت میں ایک ویران جگہ واقع ہے۔ کوئی دن میں یہ رہا سہا نشان بھی مٹ جائیگا تو کوئی نہ بتا سکیگا کہ نظیر کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں۔

آگرہ کی سیر سے فارغ ہو کر فتح پور سیکری کا عزم کیا جہاں مغلوں کے ابتدائی زمانہ کی عمارتیں کثرت سے ہیں۔ خوبیِ قسمت یہ ہے ایک ایسا لائق اور محقق رہنما ملگیا جو آجکل تاریخ فتح پور لکھ رہا ہے (یعنے مولوی سعید احمد مارہروی مولفِ حیاتِ خسرو و آثارِ خیر وغیرہ) ہمارا قافلہ آگرہ سے روانہ ہو کر فتح پور پہنچا اور پیرزادہ شیخ تجمل حسین صاحب خانقاہ نشینِ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر قیام ہوا۔ یہ حضرت شیخ سلیم چشتی کی صاحبزادی کی اولاد ہیں۔ مشائخ کے قطع نظر حکام میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ سب سے اوّل حضرت شیخ سلیم چشتی کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے۔ نہائت عظیم الشان سنگ سرخ کی عمارت ہے جس کے درمیان سنگِ مرمر کا خوبصورت مقبرہ ہے۔ یہاں وہ بزرگ آرام فرماتے ہیں۔ جن کے قدموں پر اکبر جیسا شہنشاہ سر جھکانا فخر سمجھتا تھا۔ اور جنکی دعا

کا جہانگیر سا بیٹا نمونہ تھا۔

آج نہ اکبر ہے نہ جہانگیر نہ انکی حکومت۔ مگر شیخ کی روحانی سلطنت اسی طرح برقرار ہے۔ صاحب نظر شیخ کی بادشاہی کے جلوے اب بھی دیکھ سکتے ہیں۔

اس کے بعد کامل دو روز تک اکبر کے عالیشان محلوں کی سیر کرتے رہے۔ مردانے محل۔ زنانے محل۔ حمام۔ اصطبل۔ خوابگاہیں۔ سیرگاہیں۔ عشرت خانے۔ ایک چیز ہو تو لکھی جائے۔ ہزاروں مکان ہیں۔ مگر ویران سنسان۔ آدم نہ آدم زاد۔ لارڈ کرزن نے مرمت کرا کے سنبھال دیا ہے ورنہ دو ندوں کا مسکن بنگیا تھا۔

یہاں کی سیر میں سب سے زیادہ موثر روحانیت ایک اجاڑ سراں میں دیکھی جو کسی زمانہ میں بڑی رونق کی جگہ تھی۔ نامی نامی سوداگر۔ غیر ممالک کے سیاح۔ اسی سراں میں قیام کرتے تھے۔ اسی سراں میں ایرانی مسافر مرزا غیاث اپنے شکستہ حال کنبہ سمیت ٹھہرا تھا۔ یہی مقام ہے جہاں مہرالنساسی اقبالمند لڑکی گودیوں میں پلتی تھی۔ یہ ابتدائی غربت کی نشانی ہے جس کی انتہا لاہور میں پاؤ گے۔ جو اداسی نورجہاں کی قبر پر ہے وہی اداسی اسی سراں میں موجود ہے۔ پیرزادہ شیخ عزیز الدین صاحب اور منشی عابد علی وغیرہ میرے مجنونانہ شوق پر تعجب کرتے تھے کہ خوبصورت عمارتوں کے مقابلہ میں اس کھنڈر کو کیوں پسند کرتا ہوں۔ اور بار بار اس کی زیارت کو جاتا ہوں۔ مگر کاہ انہیں کیا خبر کہ مجھ کو اس برباد سراں میں نورجہاں کی غربت مجسم نظر آتی تھی۔ کاش مولوی سعید احمد فتح پوری کی باتصویر تاریخ جلدی چھپوائیں۔ تاکہ اس سراں کی تصویر کو دوبارہ دیکھوں اور ان ضدی نادانوں کو دکھاؤں جو حسن اور دولت کو لازوال سمجھے بیٹھے ہیں ع لطیف بود حکایت دراز گفتم

حسن نظامی

حسن اور زوال

اصل خیال جرمن شعر میں دیکھا گیا۔ میں نے ناظرین مخزن کے لیے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اردو نظم میں منتقل کر دیا۔

(اقبال)

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا؟
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اسکی
وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جسکی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سنکر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو!
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

زماب

شکر نعمت

زمانے کا نہ ہو شاکی کہ تو بھی اُس میں داخل ہے
خدا کا شکر کر۔ انسان ہے۔ گویا ہے۔ عاقل ہے
ہزاروں نعمتیں ایسی ہیں جو بے مانگے ملتی ہیں
تعقل کے لئے سر ہے۔ محبت کے لئے دل ہے
ہوا میں سانس لیتا ہے۔ ہوا ہے۔ زندگی تیری
نسیم صبح سے کیا کیا تجھے آرام حاصل ہے
جسے پانی سمجھتا ہے وہ آب زندگانی ہے
یہی امرت ہے۔ جاں بخشی کا جسکی خضر قائل ہے

لگی ہے آگ بھی آٹھوں پہر رحمت رسانی میں — پکانے کو ہر چولھا۔ روشنی کو شمعِ محفل ہے

بھلا مٹی بھی کوئی شے ہو؟ لیکن اُف رے نیرنگی — ابھی گِل ہو ابھی گُل ہو۔ ابھی گُل ہو ابھی گِل ہے

چلی آتی ہو خوشبو۔ رُوح کو ہے تازگی جس سے — اِدھر ہے ہاتھ میں گجرا۔ اُدھر بدھی حمائل ہے

صَبا کو دیکھ کر چلتے۔ نہیں پھولا سماتا جی — گُلوں کو دیکھ کر کھلتے۔ شگفتہ غنچۂ دل ہے

وُہ پھولوں کے ہیں عارض۔ چُومنے سے لب نہیں تھکتے — وُہ کانٹوں کی ہیں پلکیں۔ طائرِ جاں نیم بسمل ہے

گُل و بلبل کو چھوڑو۔ آؤ اب ترکاریاں چکھو — بتانا گنبہ لذت یاں حکیموں کو بھی مشکل ہے

ہزاروں ہی ہیں میوے تو ہزاروں ہی مزے ہونگے — یہ میٹھا ہے۔ یہ کھٹا ہے۔ یہ میٹھا ترشی مائل ہے

مزوں سے بعض جا خوشبوئیں بھی کچھ لپٹی رہتی ہیں — مزہ ہے ذائقے کو۔ شامے کو لُطف حاصل ہے

اُٹھاؤ اب زمیں سے آنکھ اور افلاک کو دیکھو — وہ بحرِ بیکراں حلقۂ اُفق کا جس کا ساحل ہے

کواکب کے پڑے ہیں ترمیں جنکی لاکھوں ہی موتی — صدف بھی ہیں ہزاروں۔ ایک اُنہیں میں ماہ کامل ہے

نہیں خورشید۔ ہے غواص۔ اِدھر ڈوبا اُدھر نکلے — گہر ایسے کہ مول ایک ایک کا ملکوں کا حاصل ہے

انہی کو عالمِ تقدیس میں تسبیح کی خاطر — پروتا ہے نظر کے تار میں جو مردِ کامل ہے

الٰہی شکر تیری نعمتوں کا ہو نہیں سکتا — جو ہو بھی تو فرضنا۔ وُہ بھی اِک نعمت کی شامل ہے

تامل کب تلک مشہدؔ اِ بس سجدے میں جھک جاؤ — تواضع ہی فقط اس بحرِ بے پایاں کا ساحل ہے

ایک علمی جلسہ

۱۰ فروری ۱۹۰۶ء کو لاہور میں پنڈت رام بھجدت صاحب بی۔ اے وکیل چیف کورٹ کے [illegible] سے ایک علمی جلسہ ہوا تھا جس میں شعرا و اخبار نویس اور دیگر معززین مدعو تھے۔ ہندو مسلمانوں کے اتحاد، محبتِ وطن اور فضائلِ علم کے متعلق مضامین اور نظمیں پڑھی گئیں۔ اس جلسے میں ہمارے نامو [illegible]

[illegible]

دوست حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی نے ایک نہایت پسندیدہ و موثر نظم پڑھی جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

نیا سال تقدیر نے پھر دکھایا زمانے کا گلشن بہاروں پہ آیا
شگوفے کھلے کونپلوں کو سجایا درختوں نے شاخوں کو دولہن بنایا

کھلے پھول - سبزے لہکنے لگے ہیں
گلستاں میں بلبل چہکنے لگے ہیں

بسنت آئی بدلیں بسنتی قبائیں مہکتی ہوئی چل رہی ہیں ہوائیں
برستی ہیں گھر گھر کے کالی گھٹائیں یہ ہر سمت سے آ رہی ہیں صدائیں

پھر انداز قدرت نے بدلا ہوا ہے
پھر اب آریہ ورت چمکا ہوا ہے

چھلکتے ہیں گنگ و جمن آج کیا کیا چڑھے پھر ہیں پنجاب کے پانچ دریا
جدھر دیکھئے زرد ہے سرسوں کا تختہ پہاڑوں سے بارش کے پانی کا گرنا

چلو اس چھما چھم کی خوشیاں منائیں
چلو کاشی جی ہردوار ہو کے جائیں

چلو چل کے ترہینی کا رنگ دیکھیں نظر کی کمندیں ہمالہ پہ پھینکیں
وہ ہگلی کی رو ناہٹی کی وہ سوتیں وہ شاداب رمنے وہ ہوتوں کی جوتیں

آہا ہا عجب اُس کی قدرت عیاں ہے
بہشت بریں ہے کہ ہندوستاں ہے

کہیں مینہ برس کر وہ کُھلنا - آہا ہا وہ ہر پھول پتی کا دُھلنا آہا ہا
وہ قطروں کا کانٹے ہیں تُلنا آہا ہا گل و سبزہ کا مِلنا جُلنا آہا ہا

مُبارک ہوائے ہند یہ رنگا رنگی

اِسی پر تو مرتے ہیں سارے فرنگی

سروں پر وہ نیلاہٹیں آسماں کی — دھنک ترچھی ترچھی وہ بانکی کماں کی
اچانک جھلک مہرِ شعلہ فشاں کی — کہوں کیا کہ قدرت نہیں ہے بیاں کی
نظر باز ہی کوئی پہچانتا ہے
کہ جو دیکھتا ہے وہی جانتا ہے

یہ سب کچھ مناسب! مگر اے مری جاں — مجھے دل سے بھاتا نہیں کوئی ساماں
تری مدح حاضر ہے گو میرا ایماں — مَیں سو بار ہندوستاں تجھ پہ قرباں
مگر کیا کروں دل میں شورِ نہاں ہے
جو سچّی خوشی ہے وہ پیارے کہاں ہے

ہے دورانِ خوں۔ مجھ کو شعلہ کی تیزی — ہوا معتدل تیز ہے اِک چھری سی
فصلِ بہاری خزاں پوری پوری — یہ بارانِ رحمت گھٹائیں ہیں غم کی
تری آبیاری سے لب تشنہ ہوں مَیں
ستم دیدۂ زخمِ صد دشنہ ہوں مَیں

تجھے اپنا کچھ دھیان ہوتا نہ ہوتا — مگر کاش مَیں تجھ میں پیدا نہ ہوتا
بلا سے بُرا ہو کے اچھا نہ ہوتا — گلے میں یہ پھانسی کا پھندا نہ ہوتا
یہ گندم نما جَو فروشی نے مارا
مجھے تیری حلقہ بگوشی نے مارا

یہ دستور ہے اِک پرندہ بھی پکڑیں — تو ہم جنس اُس کے نہ دم بھر بھی دم لیں
اکٹھے وہ ہو ہو کے شورش جتائیں — سروں پر اُڑیں چونچیں ماریں
مگر ہم میں اِتنا بھی ایکا نہیں ہے
یہاں کوئی اپنا بھی اپنا نہیں ہے

نہ پاس حمیت نہ ہے پاس غیرت تجھے غیر سے لطف اپنوں سے نفرت
تو اوروں کا محتاج اوروں سے ہمت خدا ہی سنبھالیگا اب تیری حالت

بہت فقر و فاقے میں اپنی کٹی ہے
شریفوں کے پیشوں پہ پٹی بندی ہے

بھروسہ نہیں اپنے اوپر جو تجھ کو یہی تو قیامت ہے اب تجھسے کیا ہو
تری مفلسی ہان نہ جائیگی یوں تو سمجھتا ہے شل اپنے ہی بازوؤں کو

بھلا حال کیا اس کا ہندوستاں ہو
جو اپنے لئے آپ بار گراں ہو

ذریعے جو قدرت نے ہیں تجھکو بخشے انھیں پر بھروسہ کرے کر کے دیکھے
خدا چاہے بس پھر تو ہیں پار بیڑے مخالف ہزاروں ہوں تیری بلا سے

خبردار یہ فکر بیجا نہ کرنا
زمانے کی سختی کی پرواہ نہ کرنا

چٹانوں کو دیکھا ہے بیٹھے یہ اکثر تھپیڑے سمندر کے کھاتی ہیں جم کر
پڑے غل پہ غل ارتطموں کے اوپر مگر توبہ توبہ سے رکتا ہے لنگر

وہ جس طرح قدموں کو گاڑے کھڑی ہیں
اسی طرح پالی کو پھاڑے کھڑی ہیں

مثال اس سے بہتر کہاں پائیگا تو کبھی اپنے دل میں بھی شرمائیگا تو
کبھی راہ پر بھی کہیں آئیگا تو میرے دوست یا یوں ہی مٹجائیگا

دعا گو ہے شاعر بھی اس کی دعا لے
خدا کے لئے خیر اپنی منا لے

نغمۂ شوق

اُٹھا دے ذات کے رخ سے نقاب اسما کو — چھپا نہ اسم سے تو صورت مسمّےٰ کو
نقاب چہرہ الست دے ذرا نکل باہر — اِس اپنی خلوت وحدت سے سیر دنیا کو
اگرچہ پرتوِ انوار محو کر دے گا — اگر نقاب یہ الٹا جمیع اشیاء کو
اگرچہ ماؤمنی میں بھی تو ہی تو ہے نہاں — اُٹھا لے ماؤمنی سے ذرا من وما کو
اگرچہ سایۂ عنقائے مغربی ہے نہاں — مگر یہ سایہ چھپائے کہیں نہ عنقا کو
نقوش کثرت امواجِ ظاہرِ دریا — حجاب وحدتِ باطن بنے ہیں دریا کو
فروغ چہرہ عذرا چھپائے رکھتا ہے — نظر سے وامق بیدل کی روئے عذرا کو
حجاب اہل نظر سے تجھے نہیں شایان — کہ نور دیدہ ہے تو چشم مرد بینا کو

ہو مغربی کہ ہو اعجاز تو ہی ناظر ہے
چھپا نہ ان سے تو اے دوست روئے زیبا کو

اعجاز (از مغربی)

لوازم شاعری

جناب "شاد" کا لکھنا بجا صحیح درست — جناب "داغ" کا کہنا سر اور آنکھوں پر
مگر زمانے نے جو داغ بیل ڈالی ہے — ضرور چاہئے اُس کا خیال تو نظر
جو شاہ رہ پئے ادب مقرر تھی — وہ اب نہیں ہے مذاق سخن کی راہگذر

لکھی ہے شوق نے جو مثنوی حسن نگر
ہوئے ہیں شعلہ فشاں جسطرح جناب شرر

لکھی بہار پہ جو نظم برق نے دیکھو
ہیں سادگی سے ہوئے یوں سخن سرا اکبر

روش قبول جو اقبال نے یہاں کی ہے
ہوئے ہیں ناطقہ پرداز جوں فصیح ظفر

جناب حالی کی نظمیں پتا بتاتی ہیں
کہ میرے کٹکنو تیر مشق فن کریں یکسر

ہیں لکھتے نظم میں جو مولوی نذیر احمد
وہ اک جدید چمن کی روش ہے خوش منظر

یہی ہے طرز زمانے میں آجکل مقبول
تو غیر طرح کو حسن قبول ہو کیونکر

غزل لکھیں تو سنائیں کسے بتاؤ تو
نہ گل سنیں نہ عنادل پہ کچھ ہو اسکا اثر

زمانہ ہمسے چھڑا کر ہے پرانی چال
چھڑائی اگلوں نے پچھلوں کی جیسے اگڈر

جو پہلے لفظ تھے وہ اب نہیں لکھے جاتے
نہ پہلے رنگ میں اب کوئی ہو سخن پرور

نہ رزم کا ہمیں موقع نہ بزم میں ہے کیفیت
نہ وہ رموز و کنایات جلوہ ریز اثر

جو سبزی کوئی دیکھو تو ویسی ہی لکھو
دکھاؤ لفظوں میں دیکھا ہے تمنے جو منظر

امیر شاہ میسر تمہیں نہیں ہیں اب بھی
عوام ہی کو سمجھ لو سخن شناس ہنر

وہ نیچرل کے طلبگار ہیں وہی لکھو
مذاق عام پہ رکھو ہمیشہ اپنی نظر

نیا زمانہ جو کہتا ہے اس کو ترک کرو
پرانے لفظوں کو جوں ترک کردیا یکسر

کیا ہے مرکز تعلیم جب علیگڈہ کو
تو اس کو فن ادب میں بھی کیجئے رہبر

کہو کمیٹی سے کردے وہ فیصلہ اسکا
کہ فن شعر میں کیا چاہتے ہیں اہل نظر

غزل میں ہو جذبات قلوب کی حالت
لکھو قصیدے کو اڈریس کے نمونے پر

کہو جو قطعہ تو قائم رکھو تسلسل کو
جو سننے والے کے دل کو کرے قرین اثر

ہے سب سے پہلے ضروری طبیعت موزوں
جو تول تول کے لفظوں کو لائے سرتاسر

جو ایک بال کی بھی اونچ نیچ وزن میں ہو
تو ناپ تول میں محسوس ہو طبیعت پر

مگر یہ بات خدا کی ہے دین جس کو ملے
یہ مدرکات طبیعی ہیں بخشش [illegible]

نہیں ہے جسکی طبیعت میں خاص موزونی
عروض و قافیہ پڑھ کر وہ ہو سخن گستر

پڑھے وہ مثنویاں اور مختلف نظمیں
وہ مرثیوں کو بھی پڑھتا رہے بوان فر فر

عروض میں جو قواعد لکھے ہیں وہ سمجھے
ہر ایک بحر سے لائے نکال کر گوہر

نگاہ چاہئے شاعر کی دور تک جائے
خیال و فکر میں رکھتا ہو وہ بلند نظر

خدا نے دی ہے جنہیں خود طبیعت موزوں
انہیں بھی چاہئے کسب کمال ہو رہبر

پرانے لفظ جو متروک ہیں فصیحوں میں
ہمیں بھی چاہئے اُن سے ہو اجتناب و حذر

اسیطرح جو نئے لفظ اردو داخل ہوں
جو کام آئیں ہماری زبان میں یکسر

مقابلہ میں نہ ہوں جنکے دوسرے الفاظ
تو چاہئے ہمیں اُن سے ہو مستفیض اثر

فن عروض و قوافی میں جو کتابیں ہیں
ضرور چاہئے شاعر کے ہوں وہ پیش نظر

ہوئے اصول ادب کے جو داخل انشا
نہ چاہئے کہ ہو اُس راہ سے قدم باہر

و تفذحاف سبب وزن پر نگاہ رہے
ہو جسکی جتنی سمجھ اور جس کی جتنی نظر

رباعی کو قدما نے بہت ترقی دی
مگر ہماری زباں میں رواج ہے کمتر

بڑے بڑے جو مسائل ہیں یاد کے قابل
وہ اختصار سے اسمیں سما سکیں یکسر

جو لفظ غیر زبانوں کے آئیں اُردو میں
وہ بولے عام میں جاتے ہیں جسطرح اکثر

تصرف اُن میں نہ اپنا کرو نہ سمجھو غلط
جو ہیں زبانوں پہ جاری وہی لکھو یکسر

کلام چاہئے عیبوں سے پاک صاف رہے
زباں میں طرز ادا ہو فصیح و جان پرور

ہیں شاعری کے جو موضوع اُنکے لکھنے میں
ہر ایک درجہ کے لائق بنو سخن گستر

جو بات پردہ کی ہے اسکو کھولکر نہ کہو
رہے مجاز و حقیقت کا ساتھ پیش نظر

غرض یہ ہے کہ کریں سب خیال حفظ ادب
ہو ایک جادۂ معقول سب کی راہگذر

خوابِ عبرت

اک روز کہ میں خواب میں ہنگامِ سحر تھا
ناگاہ مرا تربتِ قیصر پہ گذر تھا

یاد آئی یکایک جو مجھے سوکتِ مرحوم
عبرت سے یہ دریافت کیا بادلِ مغموم

کیوں سٹ گئے وہ نقش و نگیں کیا ہوئی صولت
کیا تھی اسی دو ہات زمیں کے لئے دولت

تربت سے ندا آئی کہ اے وائے مقدر
دو ہات میں بھی پاؤں نہ پھیلا سرِ بستر

دو ہات زمیں بھی نہیں آرام کی جا ہے
ہر عضو مرا اس میں بھی کیڑوں کی غذا ہے

دنیا جسے کہتے ہیں وہ بے شبہ سرا ہے
گر اس کو کوئی سمجھے تو افسوس کی جا ہے

وہ کون ہے جو آکے مدام اس میں رہا ہے
دو روز کی ہستی ہے پھر آخر کو فنا ہے

جو شاہِ فلک جاہ تھے افلاک کے نیچے
بے نام و نشاں سو لے ہیں وہ خاک کے نیچے

ہیں جیتے ہی جی کام کے یہ درہم و دینار
جب تن سے گئی جان تو سب ہو گئے بیکار

عیسےٰ نفسوں کو بھی کیا موت نے ناچار
ہشیار کو لازم ہے رہے مرگ سے ہشیار

کہلاتے ہیں جو لوگ شہنشاہِ زمن کے
ہو لے ہیں پس مرگ وہ محتاج کفن کے

تنہا تجھے جانا ہے عدم کا وہ سفر ہے
شفقت کے لئے باپ نہ خدمت کو پسر ہے

کچھ زور کی درکار نہ کچھ حاجتِ زر ہے
جو شاہ کا ایواں ہے گدا کا وہی گھر ہے

گھر سے جو گیا کوچ تو بے گھر ہوئے دونوں
جب قبر میں اترے تو برابر ہوئے دونوں

طالب بنارسی

ترجمہ اینک آرڈن

گذشتہ اشاعت سے آگے

یہ سنکے ہوئی خجل وہ ناچار
بولی منہ کر کے سوئے دیوار
کیونکر کروں تم سے چار آنکھیں
اٹھتی نہیں شرمسار آنکھیں
کیسی ہوں میں بد نصیب اللہ
ملتی نہیں میرے بچے کی تھاہ
داخل ہوئے تم جو گھر کے اندر
میں گر گئی بار غم سے یکسر
اور اب یہ کلام مہربانی
مجھکو کرتے ہیں پانی پانی
لیکن زندہ ابھی ہے اینک
اسمیں نہیں میرے دل کو کچھ شک
کردیگا تمہاری وہ ادائی
ممکن ہے ادائی روپے کی
البتہ یہ بار لطف و احسان
اترے سر سے نہیں یہ امکان

یہ سنکے وہ بولا ہو کے مسرور
اینی! کیا تم کو ہے یہ منظور؟
دیوار سے منہ پھرا کے اینی
اٹھی اسکے قریب آ گئی
آنسو آنکھوں میں ڈبڈبائے
چہرے کی طرف نظر جمائے
تکتی رہی تھوڑی دیر صورت
پھر دیکے دعائے خیر و برکت
اور ہاتھ میں اسکا ہاتھ لیکے
آہستہ سے تکان دے کے
چھوٹا سا جو گھر میں [illegible] تھا
پکڑے ہوئے ہاتھ لائی اسکو
طے ہو چکے یوں جو سب مراتب
پلٹا خوش خوش وہ گھر کی جانب

آخر بھائی بہن کو لے کے
بھیجا اسکول میں فلپ نے
درکار کتابیں جسقدر تھیں
انکی خاطر وہ سب لگا دیں
سمجھا ہر ایک امر میں وہ
فرزندوں کے مثال ان کو
فرض اپنا سمجھ کے انکا ہر کام
دل سے کرتا رہا سرانجام
پھر بھی اندیشۂ شماتت
اس کی دیتا نہ تھا اجازت
اینی کے گھر کو آئے جائے
دل کی جو مراد بھی بر آئے
بدنامی اینی کا جو ڈر تھا
اس راہ سے بھی نہ تھا گذرتا
ہاں لڑکوں کے ہاتھ سو ہمیشہ
تھا بھیجتا رہتا کوئی تحفہ
جیسے ترکاری اور میوہ
جو باغ میں اس کے ہوتا پیدا
یا کرکے عمدگی کا حیلہ
خیرات کا ہو نہ جسمیں شبہ
اعلے پسے کا صاف آٹا
اکثر گرنی سے بھیجتا تھا

لیکن نہ ہوا قلب پہ نہار
مشکوری اینی کا کچھ اظہار
ہرچند کہ یہ تھا حال اسکا
[illegible] تھا بال بال اسکا
جوش جذبات حق گذاری
دیتا تھا نہ گفتگو کی باری
کرتی ایک کہ دو ادا کی بات
آتا وہ اگر لیئے ملاقات
جب شکر کا ذکر لب پہ لاتی
گونگے کا سا خواب گنگناتی

بچوں کا تھا پر حال گویا
گھر میں جو دیکھ پاتے انکو
صحبت میں خوش انکی رہتے تھے
بگڑتے تھے محبتوں سے
مالک گھر دار کے تھے گویا
رستے میں کبھی جو ساتھ جاتے
طفلانہ شرارتیں کبھی تھیں
کاندھے پہ کبھی سوار ہوتے
دق کرتے تھے بار بار اُس کو
اینک کی عوض فلپ ملا تھا
سچ پوچھو تو یہ زیادہ تھا کچھ
جیسے کوئی بڑے سویرے
تاریکی میں کسیکو دیکھے
لیکن اتنا بھی ہو نہ معلوم
دس سال یونہیں گذر چکے تھے

جو کچھ دنیا میں تھا فلپ تھا
ٹکڑے گلی کے لاتے انکو
بابا فلپ اُس کو کہتے تھے وہ
ملتا تھا وہ لاکھ چاہتوں سے
ہر شے پہ تھا انکا حکم چلتا
بک بک کے دماغ اسکا کھاتے
بچپن کی حماقتیں کبھی تھیں
ساتھ اُس کے گاہ کھیلتے تھے
لیکن نہ تھا ناگوار اسکو
نعم البدل اُس کا یہ بچہ گویا
وہ خواب سا [illegible]
جھاڑی کے کنارے ہو کے منہ پھیر
سائے کی مثل نہ [illegible] تھے
کس سمت گئی وہ شکل معصوم
اینک کو گئے ہوئے دنوں سے

پیدا نہ کہیں سے تھا اثر کچھ

....

اکدن کا ہے ذکر اسطرح پر
کرنے لگے ضد یہ اپنی ماں سے
گر آپ چلیں تو جائیں اماں
پاس خاطر اُس کی انکے ناچار
پھر مچلے کہیں نہ جائینگے ہم
آخر مادر سے اذن پاکے
آکر چاروں طرف وہ ڈھونڈھتا
جس طرح کا رکن تھا کبھی
[illegible] کبکے آگاہ
پہلے اس نے کیا کچھ انکار
مچلے کبھی گاہ خوشامدیں کیں
اس بچپنے پر بہت ہنسا وہ
اپنی بھی جو ساتھ جانیوالی

ابتک آئی نہ تھی خبر کچھ

....

اینی کا طفل اور دختر
جنگل کو آج سب ہیں جاتے
ہم بھی پھل چن کے لائیں اماں
چلنے کو ہو گئی وہ تیار
بابا کو بھی ساتھ لائینگے ہم
دوڑے ہوئے گھر فلپ کے آئے
اس حال سے انکو [illegible]
پھولوں کی گرد ہو رہی تھی
بابا فلپ آؤ تم بھی ہمراہ
دامن سے لپٹ گئی وہ دلدار
قسمیں کبھی دیں کبھی صدائیں
راضی چلنے پہ ہو گیا وہ
بچوں کی نہ بات اس نے ٹالی

تازہ غزلیں

پھر وہی ہم ہیں خیالِ رُخ زیبا ہے وہی
سر شوریدہ وہی عشق کا سودا ہے وہی

دانہ و دام سنبھالا مرے صیاد نے پھر
اپنی گردن ہے وہی عشق کا پھندا ہے وہی

پھر لگی رہنے تصور میں وہ مژگان دراز
رگ جاں میں خلش خار تمنا ہے وہی

پھر لگا رہنے وہی سلسلۂ ناز و نیاز
جلوۂ حسن وہی ذوق تماشا ہے وہی

پھر ہوا ہم کو دل و دیں کا بچانا مشکل
نگہِ ناز کا پھر ہم سے تقاضا ہے وہی

نازنے پھر کیا آغاز وہ اندازِ نیاز
حسنِ جاں سوز کو پھر سوز کا دعویٰ ہے وہی

محو دیدِ چمنِ حسن ہے پھر دیدۂ شوق
گل شاداب وہی بلبلِ شیدا ہے وہی

پھر چمک اُٹھی وہ کجلائی ہوئی چنگاری
رغبتِ مستی ہے وہی عشق کا شعلہ ہے وہی

آرزو جی اُٹھی پھر پیار جو اُس بت نے کیا
پھر لبِ یار میں اعجازِ مسیحا ہے وہی

پاسِ ناموس نے پھر رخصتِ رفتن چاہی
شہرتِ حسن وہی الفتِ رسوا ہے وہی

پھر ہوئی لیلےٰ و مجنوں کی حکایت تازہ
اُن کا عالم وہی نیرنگ کا نقشہ ہے وہی

نیرنگ

از تصنیف جناب نواب شمشیر بہادر اخگر رئیس اٹ جیگڑہ

ذرے افشاں کے جو عارض پہ دوپٹے کی
ری رات میں تارے سے چھٹک جاتے ہیں

دل کے شعلوں سے یوں مجبور ہیں
کہ ہوا پاتے ہی یہ اور بھڑک جاتے ہیں

کھلکھلا کر جو وہ ہنستے ہیں کبھی گلشن میں
غنچے خوش ہوتے ہیں ایسا کہ چٹک جاتے ہیں

چشمِ بیخواب ہے میری جو کبھی ہوتی ہے شرط
دیدۂ انجمِ رخشندہ جھپک جاتے ہیں

منزلِ عشق کا آساں نہیں طے ہونا
یہ وہ ہے راہ کہ لاکھوں ہی بھٹک جاتے ہیں

ناتوانی میں ہو کس طرح تجسس اُس کا
... تھک جاتے ہیں

کچھ مزے عشق کی لذت سے جو واقف ہیں تو ہم
شیخ تو ایک ہی ... جاتے ہیں

دمِ آخر یہ ہے موقوف جو وصلِ محبوب
لوگ کچھ سو چکے بالیں سے سرک جاتے ہیں

جوہری ہیں جو درِ بحرِ سخن کے اخگر
سن کے اشعار مرے دل میں پھڑک جاتے ہیں

ماء اللحم انگوری دو آتشہ

یہ ایک عطر مجرب ہے جو خالص انگور و گوشت طیور اور مقوی میوہ جات و مفرح اجزاء سے احسن
طریقہ پر کشید کیا جاتا ہے۔ ہر سال ہزاروں بوتلیں باہر جاتا ہے۔ یہ ماء اللحم ہم دوا ہم غذا ہے اسقدر سریع الاستحالہ
و زود اثر ہے کہ حلق سے اترتے ہی سیدھا خون میں شامل ہو جاتا ہے۔ اعضائے رئیسہ کے تمام افعال باقاعدہ
بنا کر ان سے وہی کام لیتا ہے جو قدرت نے [illegible]
زندگی کا مدار خون صالح پر موقوف ہے اور حکما [illegible]
سب کمزوری ہے۔ اس لئے ماء [illegible]
کام دیتا ہے۔ جو لوگ موسم سرما میں اس کا [illegible]
سکتے ہیں۔ تمام کمزوریاں دور کر کے [illegible]
لاغر جسم کو فربہ بناتا ہے۔ دماغی طاقت [illegible]
کہ برسوں کی بھولی بسری باتیں یاد آجاتی ہیں [illegible]
ہے۔ جو لوگ موسم سرما میں اس کا استعمال فرماویں گے وہ بھی
زبان پر لاویں گے۔ مالیخولیا۔ لقوہ۔ رعشہ۔ نسیان کو اڑا دیتا ہے۔ خون کی سمیت و
گندہ پن کو دور کر کے صاف خون پیدا کرتا ہے۔ نزلہ۔ زکام۔ کھانسی کا دشمن ہے۔
اشتہائے صادق پیدا کرتا ہے [illegible] ہم وہ جاں پرور دوا ہے جو جسم کو کندن
بنا کر بدن میں [illegible] بہار [illegible] ہے۔ مبہی و مقوی درجہ اول ہے باوجود ان اوصاف
کے قیمت [illegible] فی بوتل للعہ روپیہ رعایتی ایک روپیہ (عہ/ا)

نوٹ: تین بوتل سے کم بیرونجات میں روانہ نہیں کیا جاویگا۔ اور خاص شہر کو دو بوتل بھی روانہ ہو سکتا ہے۔ محصولڈاک وغیرہ بذمہ خریدار رہے۔ اسٹیشن کا مفصل پتہ تحریر کریں۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر پیشگی وصول ہونی چاہیے ورنہ تعمیل ارشاد نہیں کیجاویگی۔

خادم الحکما محمد فضل اینڈ کو مالکان شفاخانہ آفتاب حکمت لاہور

ہیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

مصنفہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر ڈبلیو آر کراپیر صاحب بہادر ایف سی ایس اے آر ایس ایم فیلو آف کیمسٹری لندن

جن کی نسبت لندن و کلکتہ و پنجاب آگرہ میڈیکل کالج کے سند یافتہ معزز ڈاکٹروں و نوابوں راجاؤں کے معزز حکیموں و صاحبان جج بہادر و مجسٹریٹ بہادر و صاحبان ڈپٹی کلکٹران بہادر و معزز یوروپین صاحبان انگریز بہادر وغیرہ نے بعد تجربہ و استعمال کے تحریر کیا لکھا ہے کہ آپ کا ہیرہ و سچے موتیوں کا سفید سرمہ آنکھوں کی بیماریوں و ترقی روشنی کے واسطے بہت مفید اور سب سے بہتر دوا ہے کہ جس کے سارٹیفکٹ بوقت فرمائش آپ کی خدمت میں ہم خود بھیجینگے۔ ملک روس وغیرہ کے معزز ڈاکٹر و حکیم آنکھوں کی بیماریوں میں اور دوا کو چھوڑ کر ہماری اس دوا کو استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے اصلی و عمدہ ہیرہ بڑی

[illegible] اور اس میں جلد کامیابی

[illegible] بہت بڑھ جاے گی اور آنکھ کے جو نقص دور ہو جاینگے [illegible] دھندلا سردی سوزش کبھی آنکھ کے سامنے کا اندھیرا پلکوں کے [illegible] کا کان [illegible] جلد شرطیہ دفع کرتا ہے (۲) کمزور نگاہ [illegible] ابتدائی موتیابند ناخونہ گگرے (۳) آنکھوں میں [illegible] ہے کمزور آنکھ کو قوت دیتا ہے آنکھوں کا میل اور [illegible] ہے۔ قیمت فی تولہ (سے) روپیہ۔

المشتہر :- رام سرن نگم - کانپور (پتا نام و مقام و نام ڈاکخانہ و ضلع خوشخط لکھو ورنہ تعمیل نہ ہوگی)

چند معزز اور قابل قدر و لایق اطمینان شہادتیں

(۱) جناب ڈاکٹر [illegible] صاحب بہادر آر جی - ایم - بی - لندن -
(۲) جناب ڈاکٹر [illegible] ایم - بی - ایم ایس - [illegible] کلکتہ -
(۳) جناب ڈاکٹر [illegible] ایم ایس اسسٹنٹ سرجن [illegible]
(۴) جناب ڈاکٹر [illegible] ایس - سی - ایس - اسسٹنٹ [illegible]
(۵) جناب ڈاکٹر [illegible] اسسٹنٹ [illegible]
(۶) جناب [illegible] صاحب پروفیسر [illegible] کالج الہ آباد
(۷) جناب مولوی [illegible] ڈپٹی کلکٹر بہادر اسسٹنٹ [illegible] کانپور -
(۸) [illegible] صاحب بی اے - بی - ایل - [illegible] بہادر مقام [illegible]
(۹) [illegible]
(۱۰) [illegible]
(۱۱) جناب [illegible] ایم - اے - ایل ایل - بی [illegible] جج بہادر گونڈا
(۱۲) جناب [illegible] بی - اے - ایل ایل - بی - [illegible] بہادر مقام [illegible]
(۱۳) جناب [illegible] مجسٹریٹ بہادر مقام [illegible]
(۱۴) جناب [illegible] بہادر [illegible] کانپور -
(۱۵) جناب [illegible]

پھر ہوئی لیلےٰ و مجنوں کی حکایت تازہ

از تصنیف جناب نواب شمشیر [illegible]

[illegible] افشاں کے جو عارض پہ کمی روپے کی
دل کے شعلوں سے یوں مجبور پھڑک اٹھتا ہیں
[illegible] جو وہ ہنستے ہیں [illegible]